ISSN 0974-7346

مارچ ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹ — عدد ۳

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰؍روپئے۔ فی شمارہ ۳۰؍روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴؍روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰؍روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰؍روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰؍روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰؍روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں :

Hafiz Sajjad Elahi
196 - Ahmad Block, New Garden Town, Lahore (Punjab) Pakistan
Tel: 0300-4682752, (R) 5863609, (O) 7280916
Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ٹرانسفر کرکے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔

بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
* معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Tel. (Ma'arif Section) 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپواکر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ | ماہ رجب۔ شعبان ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ مارچ ۲۰۲۲ء | عدد ۳

فہرست مضامین

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

شذرات

اس وقت ملک اور دنیا جہان میں مسائل اور مصائب کی یلغار ہے۔ خصوصاً وطن عزیز میں مہنگائی، بے روزگاری، غریبی اور تعلیم وصحت جیسے بنیادی معاملات سے بے توجہی نے عوام میں بے چینی اور زندگی کی بے یقینی جیسی نہایت تکلیف دہ حالت پیدا کردی ہے۔ اس سے مرکز میں بر سر اقتدار پارٹی میں بھی وہ فکر اور تشویش نظر آتی ہے جس کا اب تک شاید اس کے حکمرانوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایسے میں یو۔ پی جیسی اہم ریاست میں انتخابات کا وقت موعود بھی آگیا اور عوام کو گویا ناج اچھالے جانے کا موقع ہاتھ آگیا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ صاحبان اقتدار اپنی کوتاہیوں پر نظر کرتے، اپنے غیر جمہوری یا غیر انسانی فیصلوں پر شرمسار ہوتے، ملک سے معافی و معذرت کے طلب گار ہوتے، جو ان سے نالاں تھے ان کے نالہ وفریاد کو سنتے مگر یہ ملک کی بدنصیبی ہے کہ عوام نے اپنا مسئول ان کو بنایا جنہوں نے مسئولیت اور سیاسی قوت کو تکبر، انانیت بلکہ مطلق العنانیت سے آمیز کردیا۔ مکر و کید، وعدہ خلافی اور فریب کو سیاست کا نام دے کر اور عوام کی توجہ اصل معاملات سے ہٹا کر وقتی اور جذباتی ماحول بنادینا ایک آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ اسی نسخے کا سہارا لے کر ملک کے ایک صوبے میں زور وشور سے صدائیں بلند کی گئیں کہ ع زمانہ آیا ہے بے حجابی کا۔

***

حجاب اور بے حجابی کے معانی قدیم قدروں میں مستور تھے۔ دور جدید کے ساحروں نے اس کو ملک کا سب سے بڑا مسئلہ دکھا کر گویا رسی کو سانپ میں بدل دیا۔ کرناٹک کی ایک غیر معروف بستی میں ایک عام کالج میں چند باحجاب طالبات کو بے حجاب ہونے کا حکم دیا گیا کہ کالج کی رسم یہ چلی ہے کہ کوئی سر اور چہرہ ڈھانپ کر نہ چلے۔ دلیل یہ دی گئی کہ یہ کالج کے ضابطۂ لباس کے منافی ہے۔ طالبات نے اپنے آئینی حق کے لئے جب احتجاج کیا تو گویا ایک طوفان سا آگیا۔ ایک طالبہ شور وشر کے شعلوں میں گھر کر جوش میں جب نعرہ زن ہوئی تو یہ مسئلہ محض ایک چھوٹی سی بستی کی ایک درس گاہ کا نہ رہا، ملک کی سیاست اور عالمی اظہار خیال کا مرکز بن گیا۔ موافق اور مخالف خیالات کا سیلاب آگیا اور ادھر کئی مہینوں کی خبروں کی سرخیوں کا رنگ اسی قضیے سے گہرا ہوتا گیا۔ حجاب کی شرعی حیثیت پر بھی پھر سے غور ہونے لگا۔ آئین اور دستور میں حقوق اور اس کے احترام، اس کی حفاظت والی دفعات اور تشریحات کا از سر نو جائزہ لیا جانے لگا۔ اس سارے شور انگیز ماحول میں یہ حقیقت اوجھل سی ہوگئی کہ یو۔ پی کے الکشن کے وقت یہ شور اصلاً

اکثریتی طبقہ کی حمایت پانے کے لئے تو برپا نہیں کیا گیا؟ کرناٹک کا ایک مسئلہ یو۔پی کے لئے موقعہ کیسے بنادیا گیا؟ ایک قوم، جس کی قسمت میں جیسے صرف احتجاج کرنا لکھ دیا گیا ہے، اس کو یہ کیوں احساس نہیں ہوتا کہ برسراقتدار پارٹی یا اس کے فکری ادارے کا دارومدار ہی یہی ہے کہ ایک اقلیت سے نفرت کی جائے اور اس رویہ کو بہر صورت قائم رکھا جائے۔ اقلیت کا وجود اگر اس کے مذہب کی بنا پر ہے تو ملک کے دوسرے باشندوں کے ذہنوں کو اس مذہب کے بارے میں مشکوک ہی نہیں مسموم بنادیا جائے کہ ان کی ساری تکلیفوں پر اس مذہب کی نفرت سے ملی راحت غالب آجائے۔ ایسے میں بے حجابی جیسے خدا جانے کتنے معاملے ہیں جن کو محاربے بننے میں ذرا دیر نہیں ہوسکتی۔ وقتی رد عمل، جزوقتی جوش اور الگ الگ ٹکڑوں میں بٹ کرنا کامی کو مقدر مان لینے کی عادت پر نظر کرنے کی توفیق ملے تو کیسے؟ اصل سوال یہی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلۂ حجاب پر ایک طالبہ کے وقتی اور فوری رد عمل نے ایک بار پھر ایک تحریک کا راستہ ہموار کیا۔ لیکن یہ بھی ایک صدی سے زیادہ کے تجربوں کی بات ہے کہ تحریکیں بے شمار اٹھیں۔ تحریکوں کا برپا ہونا بہت بڑی کامیابی نہیں، کامیابی تب کہلاتی ہے جب تحریک اپنے نتائج دیرپا شکل میں حاصل کرے۔

***

کرناٹک کے اس واقعے نے دراصل ہماری ملی قیادت کو آواز دی ہے کہ بے حجابی حرف آخر نہیں۔ مسجد، طلاق، قبرستان، وقف، شہریت، وراثت، نامحرم کے ساتھ سفر حج جیسے بہت سے مسائل ایک دہائی کے اندر شدو مد سے ملکی اور انتخابی معاملات سے جوڑے گئے۔ آنے والے الکشنوں میں بھی ان جیسے اور مسائل پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ یہ سارے معاملات آئین اور دستور سے متعلق ہیں جہاں صاف صاف اقلیتوں کے جان مال، ان کی عزت آبرو، ان کے مذہب، تمدن، ثقافت، زبان اور ان کے اپنے تعلیمی اداروں کی آزادی اور شہری حقوق میں عام مساوات کے حصول کو آئینی اور قانونی درجہ عطا کیا گیا۔ اس کے باوجود جب آئین کی پامالی اور قانون سے چشم پوشی کا عمل بار بار دہرایا جائے تو پھر سمجھ لینا چاہئے کہ مقامات آہ وفغاں اور بھی ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے بہت پہلے آگاہ کیا تھا کہ اس نکتہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ کاغذ پر لکھا ہوا آئین کسی اقلیت کی حفاظت کا سامان نہیں ہے۔ حفاظت کا سامان صرف ان پر عمل ہے۔ اور یہ بھی

کہ یہ حفاظت اسی وقت ممکن ہے جب آئین کی حرمت باقی رہے۔ موجودہ برسراقتدار طبقہ، اقلیت کے لئے آئینی حقوق کو مٹانے ہی کے درپے ہے۔ دیکھنے والے خوب سمجھتے ہیں کہ کلچر، تہذیب، روایت اور ثقافت کے نام پر صرف ایک خاص نظریے کو باقی رکھنے میں جمہوریت اور سیکولرزم ہی پر اب تیشہ آزمانا رہ گیا ہے۔ یہ نظریہ آج کا نہیں۔ اس کی سنگینی کا احساس شاید ہماری قیادت کو کم رہا، لیکن خود اکثریتی طبقے میں شروع سے ایسے ذہن تھے جن کی زبان پر ان کے ہم نشین تالے نہیں لگا سکے جن کو ان جراثیم کا علم تھا جو ملک کے لئے وبائے عام بن سکتے ہیں۔

***

۲۱، مئی ۱۹۵۰ء کے پانیر اخبار میں پنڈت نہرو کی ایک تقریر چھپی جس میں انہوں نے کہا کہ ''ملک کے نوجوانوں میں ہندو کلچر کے نعروں کی رہبری کی جا رہی ہے جو نہایت گھٹیا، عامیانہ، سنگ دلانہ اور مغرورانہ ہے۔ ہمارے خیال میں کلچر طریق کردار اور طریق عمل کا نام ہے۔ اس کے معنی جو تم ہوتے ہو نہ کہ جو تم پکار کر کہتے اور بکتے ہو۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ترقی یافتہ قوم بنیں تو ہم کو چاہئے کہ ہم اپنی ذہنیت کو بھی ترقی دیں''۔ اس وقت معارف نے توجہ دلائی تھی کہ ہندوستان کے کچھ لوگوں کا اگر یہ خیال ہے کہ وہ اپنی دنیا الگ بنائیں اور ہزار ہا سال پیچھے ہٹ کر پھر ملک کو ویسا ہی بنا دیں جیسا پہلے تھا تو یہ خیال صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ خود ہندوؤں میں تفرقہ پیدا کر دے گا اور اس ملک کو بیسیوں ملکوں میں تقسیم کر دے گا۔ شکوہ کرتے کرتے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ جو زبان بر سر عام اللہ اکبر کہہ دے اس کو فوراً متعصب و متشدد کہہ کر کاٹ دینے کی جرأت کی جانے لگی۔ ایسے میں ناکردہ گناہوں کی سزا پانے والی قوم کو یہ فرصت بھی نہ ملی کہ وہ ان اسباب پر غور کر سکے جن سے نوبت یہاں تک آپہنچی۔ لیکن جن دلوں میں درد ہے، ان کی نظریں بہر حال سوال کرتی ہیں کہ انفرادی اور محدود مفادات کے اسیر ہم آخر کب تک اس قید میں رہیں گے۔

***

بات کرناٹک کے ایک کالج سے شروع ہوئی تھی۔ اس پوری داستان میں بہتوں کی نظر سے وہ طریق کردار اور طریق عمل، او جھل سا ہو گیا جو حقیقتاً اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن کی مانند ہے جب با حجاب طالبہ کو نہایت خوفناک ماحول میں اس کالج کے غیر مسلم پرنسپل کی مدد اور پناہ ملی۔ جس طرح اس طالبہ کی حوصلہ افزائی ہوئی، کالج کے پرنسپل اور اس کے عملہ کی تحسین بھی ضروری ہے۔

مقالات

ہندوستان میں اردو اور فارسی لغت نویسی کا ارتقائی سفر

ڈاکٹر صابر علی سیوانی

ٹولی چوکی، حیدرآباد (تلنگانہ) 9989796088

دنیا کی تمام زبانوں میں لغت نویسی کی مستحکم روایت رہی ہے۔ صحیح پڑھنے، درست لکھنے اور لفظوں کے مآخذ سے حتی المقدور واقف ہونے کے لئے لغت ہماری بہترین رہبری کرتی ہے۔ الفاظ کے سیاق وسباق سے واقفیت کے سلسلے میں بھی لغت بڑی حد تک معاون ثابت ہوتی ہے۔ کسی مشکل لفظ کا معنی جاننے یا اس لفظ کے درست املا سے واقف ہونے کے لئے ہمیں لغت کی مدد لینی پڑتی ہے۔ عربی، فارسی اور اردو میں لغت نویسی کی ایک طویل تاریخ ہے۔ اردو لغت میں بڑی تعداد میں ہمیں عربی و فارسی الفاظ کے معانی مل جاتے ہیں جو اردو زبان کا لاینفک حصہ بن چکے ہیں۔ لغت نویسی کے سلسلے میں ماہرین زبان وادب نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں، جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اردو لغت نویسی کا آغاز

اردو لغت نویسی کا آغاز کم وبیش سات سو سال قبل امیر خسرو کی تصنیف ''خالق باری'' سے ہوا۔ فارسی یا عربی زبان سکھانے کے لئے متعدد منظوم نصاب ناموں میں اردو زبان استعمال کی گئی۔ اس سلسلے کی پہلی کوشش ''خالق باری'' کہی جاسکتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ضیاءالدین خسرو نے ۱۶۲۲ء میں ''خالق باری'' کے طرز پر ایک نظم لکھی تھی، لیکن اسی نظم کو لوگ امیر خسرو دہلوی سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ بہر حال تحقیق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ امیر خسرو کی منظوم تصنیف ''خالق باری'' اردو کی پہلی لغت ہے۔ یہ لغت چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں لکھی گئی۔ امیر خسرو ۱۲۵۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ طبّی پودوں کے ناموں کی فرہنگ حکیم یوسفی نے ۱۵۴۳ء میں تیار کی تھی۔ ۱۵۵۱ء میں اجے چند نے ''مثل خالق باری'' کے عنوان سے ایک لغت لکھی۔ حالاں کہ یہ ایک منظوم تخلیق ہے، اور اس نظم کے عنوان کا علم نہیں، لیکن اس شاہکار تخلیق کو ''مثل خالق باری'' کے نام سے شہرت حاصل ہے۔

انگریزوں کی تیار کردہ لغات

اگر ہندوستان میں باقاعدہ لغت نویسی کے آغاز کی بات کی جائے تو سب سے اہل یورپ اور خصوصاً انگریزوں نے اپنی تجارتی، سیاسی اور تبلیغی ضرورتوں کی تکمیل کی غرض سے لغات تیار کیں۔ ان لغات میں جان

گلکرسٹ کی ''اے ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی'' (۱۷۹۳)، کپتان جوزف ٹیلر مصنف اردو انگریزی لغت (۱۸۰۸)، گلیڈون کی فارسی ہندوستانی ڈکشنری (۱۸۰۹)، کپتان ٹامس روبک کی لغت جہاز رانی (۱۸۱۱)، جان شیکسپیر کی اردو لغت (۱۸۱۳)، ولیم ٹیٹ کی مقدمہ زبان ہندوستانی (۱۸۲۷)، ڈنکن فاربس کی اردو انگلش ڈکشنری (۱۸۴۵)، ایس ڈبلیو فیلن کی اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری (۱۸۷۹) اور جان ٹی پلاٹس کی اے ڈکشنری آف اردو کلاسیکل ہندی اینڈ انگلش (۱۸۸۴) شامل ہیں۔

ان کے لغات کے علاوہ بھی متعدد فرہنگیں تیار کی گئیں جو اپنے دور کی اہم پیش کش تصور کی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن نے چار لغتیں تحریر کی تھیں: ہندوستانی انگلش ڈکشنری، انگلش ہندوستانی ڈکشنری، ہندوستانی انگلش قانونی ڈکشنری اور انگلش ہندوستانی قانونی ڈکشنری۔ فیلن اور مولوی کریم الدین دہلی نے ''مصنفان تذکرہ شعرائے ہند'' ۱۹۴۸ میں تحریر کیا۔ مولوی کریم الدین نے اسی دور میں ''کریم اللغات'' مرتب کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

اردو لغات کی ترتیب

اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں اہل ہند کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اردو لغات کی ترتیب و تدوین عمل میں لائی جائے۔ ملا عبدالواسع ہانسوی نے سترہویں صدی کے اواخر میں ''غرائب اللغات'' ترتیب دی۔ اس میں اردو الفاظ کے معانی فارسی میں تحریر کئے۔ ایک عرصے کے بعد سراج الدین علی خان آرزو نے اس پر نظر ثانی کی اور بہت سے الفاظ اور معانی کے اضافے کئے، غلطیاں درست کیں اور اس کا نام ''غرائب اللغات'' سے بدل کر ''نوادر الالفاظ'' رکھا۔ اس کی تفصیل اردوئے قدیم مصنفہ سید شمس اللہ قادری میں موجود ہے۔ ان دونوں لغات کی حتمی تاریخ اشاعت معلوم نہیں۔ غالب قیاس ہے کہ یہ دونوں فرہنگیں ۱۶۹۵ تا ۱۷۴۵ کے درمیان منظر عام پر آئی ہوں گی۔ ''نوادر اللغات'' کا نیا ایڈیشن سید عبداللہ کا مرتبہ 1951 میں کراچی پاکستان سے شائع ہوا۔

میر اوحد الدین بلگرامی نے اردو لغات اور محاورے ''نفائس اللغات'' میں جمع کئے۔ یہ لغت ۱۸۳۷ میں تحریر کی گئی۔ ''نفائس اللغات'' میں اردو الفاظ کی فارسی میں وضاحت کی گئی ہے اور ہر اردو لفظ کے فارسی اور عربی مترادف الفاظ پیش کئے ہیں۔ سید ضامن علی جلال کی لغت ''گلشن فیض'' ۱۸۸۰ میں شائع ہوئی۔ ''سرمایۂ زبان اردو'' مرتبہ سید ضامن علی جلال (۱۸۶۶) بھی اہم لغت ہے۔

نیاز علی بیگ نکہت کی ''مخزنِ فوائد'' اردو اصطلاحات و محاورات پر مشتمل لغت اسی عہد میں شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں منشی چرنجی لال کی ''مخزن المحاورات'' کم و بیش دس ہزار محاورات پر مشتمل ہے۔ شاہ حسین حقیقت کی ''خزینۃ الامثال'' اور میر شمس الدین فیض کی ''خزائن الامثال'' ۱۸۵۴ اور اس کے آس پاس شائع ہوئیں۔ یہ اردو کی ابتدائی لغات ضرور ہیں، لیکن مستند لغات اور مبسوط امثال و محاورات پر مشتمل اہم اور دستاویزی مثالیں بھی ہیں۔ کاظم علی جوان نے اٹھارہویں صدی کے آخری حصے میں سب سے پہلا شاہکار

کارنامہ ''شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان'' کے نام سے لکھا، جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ لغت اصطلاحات اور محاورات پر مشتمل اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔

مرزا مچھو بیگ عاشق کی تالیف ''بہارِ ہند'' اردو محاورات کی لغت ہے۔ ۱۸۸۸ میں اس لغت کی صرف الف کی تختی چھپ کے منظر عام پر آئی، باقی کا علم نہیں۔ جلیل مانکپوری نے، جو حیدرآباد کے اہم اور استاد شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں، ''معیار اردو'' کے نام سے ایک لغت لکھی۔ شمس الدین فیض حیدرآبادی اور قدر بلگرامی نے بھی لغات پر کام کیا تھا، لیکن ان کی تالیف منظر عام نہیں آسکی۔ ''فرہنگ عامرہ'' فارسی لغت ہے، جس کے معانی اردو میں دیئے گئے ہیں۔ یہ لغت عبداللہ خویشگی نے مرتب کی تھی۔ اسی طرح مولوی فیروزالدین کی ''جامع اللغات'' درسی استعمال کے لئے مفید لغت تصور کی جاتی ہے۔

بعض اہم لغات

ہندوستان میں لغت نویسی کی ایک قابل قدر روایت رہی ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں اردو لغات کی تیاری عمل میں لائی گئی، جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ ہر فن کے کچھ اصول ہوتے ہیں، اسی طرح لغت نویسی کے بھی اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ فن لغت نویسی کے اصولوں کی روشنی میں اردو میں سب سے مستند اور جامع لغت ''فرہنگ آصفیہ'' ہے، جو سید احمد دہلوی کی شاہکار تحقیقی کاوش ہے۔ فردِ واحد کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے۔ یہ لغت ۱۸۹۲ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ یہ لغت چار جلدوں پر مشتمل ہے جو سالہا سال کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے اور حضور نظام کی سرپرستی اور دریادلی کا مثالی نمونہ ہے۔ سید احمد دہلوی کی ایک اور لغت ''لغات النساء'' بھی یادگار ہے، جو دہلی کی بیگماتی زبان، اصطلاحات اور محاورات کا مجموعہ ہے۔

''فرہنگ آصفیہ'' کی تیاری اور طباعت کے سلسلے میں جن دشواریوں کا مصنف کو سامنا کرنا پڑا، اس کے متعلق انہوں نے اس کے دیباچے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولوی سید احمد دہلوی کو اتنی بڑی لغت چھاپنے کے لئے زر کثیر کی ضرورت تھی، جس کا حصول مشکل تھا۔ خوش قسمتی سے ۱۸۸۸ء میں سرآسمان جاہ بہار تشریف لائے، جہاں مولوی صاحب کسی اسکول میں ملازم تھے۔ مولوی صاحب نے وزیراعظم حیدرآباد کی خدمت میں حاضر ہو کر اس شاہکار لغت کا مسوّدہ پیش کیا۔ سید علی بلگرامی کے معائنے کے بعد اسے منظور کر لیا گیا اور انعام کا وعدہ بھی کیا گیا۔ ۱۸۹۲ء میں جب یہ لغت مکمل ہو گئی تو اس کا نام ''فرہنگ آصفیہ'' رکھا گیا۔ اس لغت کی طباعت اور انعام کے حصول کی غرض سے مولوی صاحب کو متعدد بار حیدرآباد جانا پڑا۔ بالآخر انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی اور پچاس روپیہ ماہانہ بطور پنشن اور پانچ ہزار روپئے کتاب کے لئے انعام دیا گیا۔ علاوہ ازیں حکومت پنجاب نے بھی مولوی صاحب کی مالی مدد کی اور اس طرح ۱۸۹۲ء ''فرہنگ آصفیہ'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ یہ لغت اردو لغات کی فہرست میں اہم ترین مقام رکھتی ہے۔ اس لغت کی اشاعت کی روداد رام بابو سکسینہ اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' (صفحہ

۳۲۲) میں بیان کی ہے۔ ہندوستان کے اہم علمی ادارے ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے اس لغت کی اہمیت اور مقبولیت کے باعث اس کا عکسی ایڈیشن جہازی سائز پر ۱۹۷۴ میں شائع کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی بھی اس لغت کو چھوٹے سائز پر (عکسی ایڈیشن) متعدد مرتبہ شائع کر چکی ہے۔

اس لغت کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے عہد کی تمام روایات، اقدار، تہذیبی باقیات، رسوم ورواج، عدالتی و بیگماتی محاورات، پیشہ وروں کی اصطلاحات، اہل حرفہ کے روزمرہ ضرب الامثال، اشارات و کنایات، تاریخی واقعات، تذکیر و تانیث کے نکات، فلسفہ وطبعیات کی موشگافیوں، علم صرف و نحو کے قواعد، اولیائے ہند کے اسمائے گرامی اور فقہائے ہندوستان کے مختصر حالات زندگی، کلاسیکی روایات ولفظیات کی تشریح کے ساتھ ساتھ موسیقی کے موزوں نکات وغیرہ کی خوش اسلوبی سے وضاحت کرتی ہے۔ ۔ یہ امتیازات واوصاف ''فرہنگ آصفیہ'' کو دوسری لغات سے ممتاز بناتی ہیں۔ اس لغت کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ الفاظ کے محلّ استعمال سے متعلق اپنے دور کے مشہور اور مستند شعرا کے اشعار سند کے طور پر اس میں پیش کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس عہد کی ٹھمریوں، دادرا خیال، لوک گیت، دوہوں، کہہ مکرنیوں اور پہیلیوں کے ذریعہ بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان تمام خصائص کی روشنی میں اس لغت کو ایک انسائیکلوپیڈیا کہہ سکتے ہیں۔

امیر اللغات

فرہنگ آصفیہ کے طرز پر امیر مینائی نے بھی ایک اہم لغت ''امیر اللغات'' کی تیاری کا بیڑا اٹھایا لیکن وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لغت کی صرف دو جلدیں الف ممدودہ اور الف مقصورہ کے الفاظ کی ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہو سکیں۔ امیر مینائی نے اردو محاوروں کا احاطہ اور مستند شعرا کے اشعار کا اضافہ بڑی محنت و کوشش کے ساتھ کیا۔ یہ ناتمام لغت بھی امیر مینائی کا اہم کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔

لغت نویسی کے جن اصولوں کی پیروی امیر مینائی نے کی تھی بعد کے لغت نویسوں نے بھی اس راہ کو اپنایا اور لغت نویسی کا فریضہ انجام دیا۔ امیر مینائی کو ''امیر اللغات'' کی تالیف کے سلسلے میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں، اس کی پوری داستان اس لغت کے دیباچے میں انہوں نے لکھی ہے۔ نہایت آسان اور رواں اردو میں لکھا گیا دیباچہ قافیہ پیمائی سے بالکل پاک ہے۔ اس دیباچے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ امیر مینائی کے دل میں امیر اللغات کی تکمیل کی کیسی شدید خواہش پوشیدہ تھی:

> میں نے ہوش سنبھالا، آنکھیں کھولیں، تو یہ دیکھا کہ اچھے اچھے اہل زبان اور زبان دان سرزمین سخن کے فرمانروا ہیں۔ انہیں صحبتوں میں اردو زبان کی چھان بین کا شوق مجھے ہوا۔ اسی زمانے میں یہ آرزو پیدا ہوئی اور بڑھ کر بے چین کرنے لگی کہ اردو الفاظ کے بکھرے ہوئے موتیوں کی ایک خوشنما لڑی بناؤں۔ اتنے میں

لکھنؤ کی سلطنت مٹ گئی اور غدر ہو گیا۔ وطن کی تباہی اور گھر بار کے لٹنے سے حواس ہی جمع نہ ہو سکے، الفاظ کیسے؟ لیکن اس آرزو کی آگ دل میں سلگتی رہی، یہاں تک کہ فردوس مکاں نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والئ رامپور نے مجھے طلب فرما کر عزت کا خلعت اور اطمینان کا سرمایہ دیا۔ اب میں پھر اپنے سلسلے کو بڑھانے لگا۔ مگر اس زمانے میں رامپور کی عدالت دیوانی میرے متعلق تھی۔ نواب فردوس مکاں اپنے کلام میں بھی مشورہ فرماتے تھے اور فن شاعری کے مشغلے جو نئی نئی شکلوں سے پیش آتے ہیں۔ وہ یوں بھی کم فرصتی کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اتنی مہلت تو میں نہ پاسکا کہ اپنے ارادے کو پورا کروں تاہم کچھ کچھ شغل چلا گیا۔ جب خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر کا عہد آیا تب فرصت کی کمی اور بڑھی۔ لیکن کچھ ہی ہوا، یہاں وہی دھن بندھی رہی۔ ۱۸۸۴ء میں علوم کے قدرداں الفرڈ لائل صاحب بہادر (لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ) نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔ نواب خلد آشیاں نے مجھے حکم دیا۔ یہاں تو یہ تمنا ہی تھی۔ فوراً ''آنکھ'' کے لفظ کا ایک نمونہ تیار کیا، جسے نواب خلد آشیاں نے جنرل محمد اعظم الدین خاں بہادر (سابق سفیر ریاست وحال وائس پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی) کے ذریعہ سے الفرڈ لائل صاحب بہادر کے پاس بھیجا۔

اس سلسلے میں وضاحت کرنی ہے کہ لفٹننٹ گورنر کے پاس جب یہ نمونہ پہنچا تو انہوں نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور لغت کی تیاری میں سرپرستی کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ امیر مینائی بھی بہت خوش ہوئے کہ مانگی مراد برآئی۔ لیکن کچھ ہی دنوں میں لفٹننٹ گورنر الفرڈ لائل رامپور سے چلے گئے اور نواب خلد آشیاں کلب علی خاں کا انتقال ہو گیا جس کے بعد ''امیر اللغات'' کا کام منقطع ہو گیا۔ لیکن نواب حامد علی خاں کے عہد میں اس کی اشاعت شروع ہوئی تو محض امیر اللغات کی دو جلدیں ہی منظر عام پر آسکیں۔ اس طرح امیر اللغات کی تالیف کا کام ادھورا رہ گیا اور کچھ برسوں کے بعد امیر مینائی کو داغ دہلوی نے حضور نظام کے اشارے پر حیدرآباد بلا لیا۔ امیر حیدرآباد چلے گئے، لیکن جاتے ہی وہ بیمار ہو گئے اور بالآخر اکتوبر ۱۹۰۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ امیر اللغات کی اٹھائیس جلدیں ''فرہنگ حامدیہ'' کے نام سے مسودے کی شکل میں رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہیں۔

دوسری کوششیں

مولانا احسن مارہروی نے ''فصیح اللغات'' کے نام ایک لغت کی تیاری شروع کی تھی۔ داغ دہلوی سے اس کے لئے سند کے اشعار بھی لکھوائے تھے، لیکن یہ لغت تکمیل کو نہیں پہنچ سکی۔ نور الحسن نیّر کاکوروی نے ''نور اللغات'' ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۰ء کے درمیان تیار کی اور اس کی اشاعت ۱۹۳۱ء میں عمل میں آئی۔

''نور اللغات'' نے ''امیر اللغات'' (مؤلفہ امیر مینائی) کی کمی پوری کرنے کا کام کیا۔ ''نور اللغات'' کا شمار اردو کی جامع و مبسوط لغات میں ہوتا ہے۔ بڑے بڑے محققین نے دلائل و شواہد کے طور پر اس لغت کا استعمال کیا اور اس کا حوالہ اپنی تحقیقات میں دیا ہے۔ نیّر کاکوروی ۱۸۶۵ء میں کاکوری (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ میں کاکوری واقعہ اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ نیّر کاکوروی نے متروکات پر تفصیل سے اس لغت میں بحث کی ہے۔ ساتھ ہی دہلی اور لکھنؤ کے اختلافات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انگریزی کے روز مرہ بول چال کے الفاظ بھی اس لغت میں شامل کئے گئے ہیں۔ تاکہ پڑھنے میں قاری کو مشکل نہ ہو اس لئے تلفظ کی وضاحت کی غرض سے اعراب کا استعمال کیا گیا ہے اور ہم وزن الفاظ کا بھی اندراج عمل میں لایا گیا ہے۔ کم و بیش نوے سال گزر گئے اس لغت کی اشاعت کو، لیکن اس کے باوجود اس وقت بھی اس کو مستند ترین لغت کا مقام حاصل ہے۔ مشہور محقق رشید حسن خاں کی تحقیقات میں بار بار اس لغت کا حوالے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ اس لغت کی اشاعت کے پانچ سال بعد ۱۹۳۶ء میں نیّر کاکوروی کا انتقال ہو گیا۔ ''نور اللغات'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ آج بھی اس لغت کو اردو کی بہترین لغت مانا جاتا ہے۔ ''نور اللغات'' کے بعد آج تک جتنی بھی لغات کی تالیف ہوئی ان میں سے کوئی بھی لغت اس پائے کی نہیں ہے حالاں کہ ۱۹۳۱ء کے بعد سیکڑوں لغات منظر عام پر آئی ہیں۔

فارسی لغات

ہندوستان میں لکھی گئی فارسی کی ایک جامع اور مستند لغت ''بہار عجم'' مؤلف ٹیک چند بہار کا ذکر کرنا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ لغت ۱۷۳۹ء میں مکمل ہوئی۔ بہار عجم کے سرورق پر یہ عبارت نقل ہے۔ '' کتاب فیض انتساب نتیجۂ افکار ٹیک چند بہار منشی عطاد رقم نامزد بہ ''بہار عجم''، بتحشی مخزن تحقیقات اعنی کتاب غیاث اللغات در ۱۲۸۲ ہجری بہ تصحیح اتم در مطبع سراجی محمد سعادت علی خاں بمقام دہلی زیور طبع پوشید''۔ بہار عجم پر غیاث اللغات کے مصنف محمد غیاث الدین بن جلال الدین بن شرف الدین نے حواشی تحریر کئے ہیں۔ بہار نے یہ لغت عمر کے ۵۳ برس گزرنے کے بعد بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل کی تھی۔ یعنی جب یہ لغت مکمل ہوئی تو بہار کی عمر ۷۳ برس تھی۔ ''بہار عجم'' کی انفرادیت، جامعیت اور معنویت کے متعلق مرتبین ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' نے نہایت ایماندارانہ رائے قائم کی ہے:

> بہار نے معانی و مفاہیم کی وضاحت و تصدیق و تائید کے لئے قدیم و جدید شعرا کے اشعار نقل کئے ہیں۔
> ''بہار عجم'' میں حرف ''آب'' سے جو تراکیب وضع کی گئی ہیں ان کی تعداد ۲۹۱ اور ''آتش'' سے ۱۴۰ ہیں۔
> بہار نے اپنے تقریباً ۱۰۰ منابع کا ذکر کیا ہے۔ مصنف نے اپنے متعدد مآخذ سے بڑے سلیقے، علمی طریقے اور ادبی ذوق کے ساتھ گل چینی کی ہے۔ بہار نے اس معرکۃ الآرا کام میں جن اعلیٰ تحقیق و تلاش اور غور و

فکر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس نے قاری کو دیگر فرہنگوں سے بے نیاز کر دیا ہے اور اسی وجہ سے بعد کے فرہنگ نویسوں نے اسے ایک اہم مأخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ''بہار عجم'' ہندوستان اور ایران سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔[1]

ٹیک چند بہار، محمد شاہ اور اس کے جانشینوں کے دورِ حکومت میں دہلی میں مقیم تھے۔ انہیں دربار سے ''رائے'' یا ''راجا'' کا خطاب بھی حاصل ہوا تھا۔ انہوں نے فارسی کے شاعر سراج الدین علی خاں آرزو اور شیخ ابوالخیر خیر اللہ وفائی سے کسب فیض کیا تھا۔ ان کی دیگر تصانیف میں جواہر الحروف، نوادر المصادر، ابطال ضرورت، جواہر الترکیب شامل ہیں، لیکن انہیں فارسی دنیا میں شہرت ''بہار عجم'' کی وجہ سے حاصل ہے۔ فارسی زبان میں کثیر تعداد میں فرہنگیں ہندوستان میں لکھی گئیں، جن میں فرہنگ جہانگیری، مجمع الفرس، فرہنگ رشیدی، برہان قاطع اور غیاث اللغات وغیرہ اہم ترین لغات میں شامل ہیں لیکن ان تمام لغات پر ''بہار عجم'' کو فوقیت حاصل ہے۔

حیدر آباد کی علمی شخصیت نواب عزیز جنگ ولا کی فارسی لغت ''آصف اللغات'' ۱۷ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس لغت میں فارسی الفاظ کے صرف و نحو اور مترادفات درج کئے گئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک لغت اردو میں بھی ''اردو مترادفات'' کے عنوان سے اردو کے مشہور شاعر احسان دانش نے بھی ترتیب دی ہے۔ اس لغت میں الفاظ کے معانی کی جگہ ان کے مترادفات دیئے گئے ہیں۔ جو اردو ادباء شعرا و مصنفین کے لئے نہایت کار آمد اور مفید ہے۔ اپنے موضوع پر یہ بنیادی کام ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اس کا پہلا ایڈیشن مرکزی اردو بورڈ پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی اس کی اشاعت عمل میں آچکی ہے۔

اردو کی دوسری لغات

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان خواجہ عبدالمجید نے لاہور سے ''جامع اللغات'' شائع کی۔ اس کی ضخامت ''نور اللغات'' سے بھی زائد ہے۔ یہ لغت چار جلدوں پر محیط ہے۔ اردو، فارسی، سنسکرت اور ہندی زبانوں کا مجموعہ ہے۔

اردو کی سب سے بڑی اور ضخیم لغت کے طور پر ''مہذب اللغات'' کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ لغت ۱۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔ مہذب لکھنوی نے اس لغت کی پہلی جلد ۱۹۵۵ء میں شائع کی۔ آخری جلد یعنی تیرہویں جلد ۱۹۸۲ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئی۔ اس لغت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فصیح اور غیر فصیح اور دلّی و لکھنؤ کی زبان و محاورے کے فرق کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں افراد و اشخاص کے سوانحی خاکے بھی درج کئے گئے ہیں۔ تلفظ کی نشاندہی بھی عبارت کو پیش کر کے کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے

---

[1] جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (ادبیات) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء صفحہ ۱۱۹۔

''مہذب اللغات'' بھی اپنی نوعیت کی منفرد فرہنگ ہے۔ اس کے باوجود اسے مکمل لغت نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اس میں ''نوراللغات'' جیسی فنّی خوبیاں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مولوی ظفر الرحمن کی ''فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں'' آٹھ جلدوں پر محیط ہے۔ یہ لغت کرخنداری اور پیشہ ورانہ الفاظ واصطلاحات پر مشتمل ہے۔ اس لغت کو مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو سے شائع کیا تھا۔ مولوی عبدالحق کا ہی ایک اہم ترین کارنامہ انگریزی اردو ڈکشنری ہے جو اسٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اب تک اردو انگریزی ڈکشنری کی کمی محسوس کی جاتی تھی، اس کمی کو مولوی عبدالحق نے پورا کر دیا[۲]۔ جمیل جالبی نے بھی اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو انگریزی ڈکشنری مرتب کر کے شائع کی۔ یہ لغت بھی اپنی نوعیت کی منفرد لغت ہے۔ ہندوستان کے کئی اداروں نے اس ڈکشنری کو شائع کیا ہے۔ قومی کونسل نئی دہلی کی جانب سے مشہور ناقد کلیم الدین احمد کی مرتبہ ڈکشنری ''جامع انگریزی اردو لغت'' چھ جلدوں میں برسوں قبل شائع ہو چکی ہے۔ یہ لغت بھی کافی اہمیت کی حامل ہے۔

اردو کی مقبول و مبسوط اور ضخیم لغت مولوی فیروزالدین کی ''جامع فیروزاللغات'' ہے۔ یہ لغت ۱۴۷۲ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ایک لاکھ پچیس ہزار قدیم وجدید الفاظ کے معنی، صحیح تلفظ، علمی، ادبی اور فنّی اصطلاحات، مرکبات، محاورات اور ضرب الامثال شامل ہیں۔ فیروز اللغات کی اشاعت ۱۹۵۰ء کے آس پاس عمل میں آئی تھی۔ ۱۹۶۷ میں اس لغت پر نظر ثانی کی گئی اور ہندی حروف کو علیحدہ کر کے اس کی اشاعت عمل میں لائی گئی۔ میرے زیر نظر ۱۹۸۸ء کا ایڈیشن ہے جو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کا ہے جس میں تقریباً پچیس ہزار جدید الفاظ اور اصطلاحات کے اضافے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ طلبا کی ضرورت کے پیش نظر ''فیروزاللغات'' عام کتابی سائز پر بھی اہم ترین الفاظ واصطلاحات و محاورات کو شامل کرتے ہوئے ضخامت کم کر کے شائع کی گئی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے متعدد اداروں نے اس لغت کو اپنے اپنے انداز سے شائع کیا ہے۔ لیکن آج جب کہ نئے نئے الفاظ، اصطلاحات اور تکنیکی و سائنسی لفظیات اردو میں رائج ہو چکے ہیں، ان کے اندراج کی ضرورت ہے۔ کم و بیش پچاس برسوں سے اس لغت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے جس کی شدید ضرورت ہے۔ اس لغت میں بعض غلطیاں بھی موجود ہیں جس کی تصحیح ضروری ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ اردو میں ایک ایسی لغت کی ابھی بھی ضرورت ہے جو ضخامت میں بھلے ہی فیروزاللغات سے کم ہو

---

[۲] یہ ڈکشنری اب پرانی ہو چکی ہے۔ اس کی اشاعت ۱۹۳۷ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے انگریزی میں بہت سے نئے الفاظ اور اصطلاحات داخل ہوئے ہیں، نیز بہت سے الفاظ کے معانی بھی بدل گئے ہیں۔ اس ڈکشنری کو بار بار پہلی ہیئت میں شائع کرنے سے بہتر ہے کہ اس پر نظر ثانی کی جائے اور نئے الفاظ کو اس میں شامل کیا جائے (مدیر)۔

مگر جدید دور کے تقاضوں کی تکمیل کر سکے اور جس میں قدیم وجدید علوم وفنون سائنس، ٹکنالوجی، اصطلاحات اور محاورات کے حوالے سے نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ یہ کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے بہتر کوئی دوسرا ادارہ نہیں کر سکتا ہے۔ قومی کونسل کو وضعِ اصطلاحات کے حوالے سے ابھی کام کرنے کی شدید ضرورت ہے، کیوں کہ وضعِ اصطلاحات کے متعلق اصول وقواعد کے ضمن میں سید وحید الدین کی تالیف ''وضعِ اصطلاحات'' (حیدرآباد ۱۹۲۱ء) اس موضوع پر جو پہلی کتاب منظر عام پر آئی اس کے بعد اس نوعیت کا کوئی دوسرا کام اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ وحید الدین سلیم کی اس تحقیقی کتاب کے بعد مولوی عبدالحق، برج موہن دتاتریہ کیفی، سید سلیمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے اصحاب قلم نے قلم اٹھایا، لیکن اس کے باوجود فی الوقت جو نئی نئی اصطلاحات اور انگریزی کے نئے نئے الفاظ اردو میں ہو بہو داخل ہو کر مستعمل ہو چکے ہیں۔ ایسی اصطلاحات و الفاظ کی اردو میں اصطلاح سازی کی شدید ضرورت ہے۔ وضع اصطلاحات کے موضوع پر پاکستان سے عطش درانی کی کتاب ''اردو اصطلاحات سازی'' کم و بیش بیس سال قبل منظر عام پر آئی، اس کے بعد ہندوپاک میں اس طرح کا کوئی دوسرا کام اب تک نہیں ہو سکا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے لغات کی اشاعت و ترتیب کے سلسلے میں اہم کام انجام دیئے ہیں۔ فرہنگ آصفیہ کی اشاعت کے علاوہ مختلف فنون و موضوعات پر مشتمل متعدد فرہنگیں شائع کی ہیں۔ ان میں ''دکنی لغت'' شامل ہے جسے پروفیسر سید جعفر نے ترتیب دیا۔ بڑی محنت سے اس فرہنگ کی ترتیب عمل میں آئی۔ ''دکنی لغت'' قومی کونسل کی سلسلہ وار نصابی وغیر نصابی اشاعت کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس لغت میں ساڑھے پانچ سو سال قدیم الفاظ تک کو جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان پر اعراب بھی لگائے گئے ہیں تاکہ قاری کو دکنی الفاظ کے صحیح تلفظ کی ادائیگی میں کوئی دقت نہ ہو۔ الفاظ کے معنی کے ساتھ ساتھ ان کے استعمال کی چار چار مثالیں بھی دی گئی ہیں اور ماخذ کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ مثالیں زیادہ تر نظموں سے پیش کی گئی ہیں اور شاعر کا نام بھی درج کیا گیا ہے۔ دکنی زبان و ادب کے حوالے سے سیدہ جعفر کی ''دکنی لغت'' ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

شمالی ہندوستان کے بیشتر علاقوں میں ہندی زبان بولی جاتی ہے اور کہیں کہیں اردو بولنے والے افراد موجود ہیں تو ان کی بولیوں پر بھی مقامی ہندی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ بہت سے مترجمین کو، جنہیں ہندی سے اردو میں ترجمے کا کام کرنا پڑتا ہے، اردو لغت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے دو جلدوں پر مشتمل ایک ''جدید ہندی اردو'' لغت کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور اس ڈکشنری کی تالیف کی ذمہ داری معروف ماہر لسانیات پروفیسر نصیر احمد خاں (سابق استاد جواہر لال نہرو یونیورسٹی) کو سونپی گئی۔ انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد جدید ہندی اردو لغت کی

تدوین کا فریضہ انجام دیا۔اس لغت میں قدیم وجدید ہندی کے الفاظ اور معانی ومفاہیم ہندی اور اردو دونوں رسم الخط میں دیئے گئے ہیں۔اس لغت کی تدوین میں جن چیزوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے ان میں یونیورسٹیوں کے نصاب، قدیم دستاویزات، صحافتی زبان اور عام بول چال کے الفاظ شامل ہیں۔الفاظ کے مآخذ کے لئے عربی، فارسی اور سنسکرت لفظیات کی بنیاد تک رسائی کی کوشش کی گئی ہے۔علاقائی بولیوں کے الفاظ، کبیر، سورداس اور تلسی داس وغیرہ کے کلام کے الفاظ، محاورے اور کہاوتیں بھی اس میں شامل ہیں۔ہندی اندراجات کے معانی اردو میں دے کر انہیں اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں علامات واعراب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے تاکہ متن کی قرأت اور تلفظ کی ادائیگی میں کوئی دشواری نہ ہو۔دو جلدوں پر مشتمل اس لغت میں تقریباً سوا لاکھ الفاظ جمع کئے گئے ہیں۔چار ہزار محاورے اور کہاوتیں بھی شامل ہیں۔پہلی جلد ۱۵۷۵ صفحات پر اور دوسری جلد ۱۵۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں کونسل نے مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی فرہنگیں شائع کی ہیں۔ جن میں اردو کی صوتی لغت (مرتب نصیر احمد خاں) فرہنگ اصطلاحات شماریات، فرہنگ اصطلاحات قانون وغیرہ شامل ہیں۔توقع ہے کہ اردو لغات کی ضرورت کی تکمیل کی راہ آسان کرنے میں کونسل مدد کرے گی۔

آخر میں ایک اور اہم ڈکشنری کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور وہ ہے حیدرآباد کے یعقوب میراں مجتہدی کی ''اردو انگریزی لغت مجتہدی''۔یعقوب میراں مجتہدی ۱۹۳۱ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے گریجویشن کیا۔ڈپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن حکومت آندھرا پردیش میں ملازم ہوئے۔ڈپٹی ڈائرکٹر آف ٹرانسلیشن کے عہدے سے ۱۹۸۹ء میں سبکدوش ہوئے۔۲۱ جولائی ۲۰۱۰ء کو ان کا حیدرآباد میں انتقال ہوا۔یعقوب میراں مجتہدی کو اردو اور انگریزی زبان پر عبور تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تنہا یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔''اردو انگریزی لغت مجتہدی'' تین جلدوں پر مشتمل ہے، جس میں ایک لاکھ پچیس ہزار الفاظ ہیں۔یہ لغت چنچل گوڑہ حیدرآباد سے ۲۰۰۹ء میں شائع ہوئی۔ برسوں کی محنت کے بعد مجتہدی صاحب نے بغیر کسی کی مدد کے یہ کارنامہ انجام دیا۔جو قابل ستائش ولائق تقلید کارنامہ ہے۔

لغت نویسی کا عمل موجودہ دور میں رُک سا گیا ہے کیوں کہ عہد حاضر کے نقاد، دانشور اور محققین اس دقت طلب کام کی ذمے داری اپنے سر نہیں لینا چاہتے ہیں اور نہ ہی کوئی ادارہ یہ جوکھم اٹھانا چاہتا ہے۔ ''فیروز اللغات'' کے بعد کم وبیش نصف صدی کا عرصہ گزر چکا ہے۔اس عرصے میں کوئی بھی مستند لغت منظر عام پر نہیں آسکی ہے۔حالاں کہ اس طویل مدت میں کثیر تعداد میں ہندی، انگریزی اور دوسری زبانوں کے الفاظ اردو میں داخل ہو چکے ہیں اور ان کا استعمال ہو بہو اردو میں ہوتا ہے۔اس جانب توجہ کی ضرورت ہے اور ایک ایسی لغت کی تدوین وقت کا تقاضہ ہے جس میں جدید الفاظ کے ساتھ ساتھ مروّجہ اصطلاحات اور تراکیب وغیرہ کی اصول فرہنگ کے مطابق تدوین عمل میں لائی جائے۔

مدحِ پیمبرؐ بزبانِ حیدرؑ

شمائلِ نبویؐ سے متعلق حضرت علیؓ کے اشعار پر مشتمل وصلیاں

ڈاکٹر محمد ارشاد ندوی نوگانوی

اولڈ کیمیو مشین فیکٹری، لال مسجد۔رام پور

nadwiirshad@gmail.com

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہٗ نہ صرف آنحضرت ﷺ کے عم زاد برادر اور اُنؐ کی شرف دامادی سے مشرف اور خلفاء راشدین میں سے ہیں بلکہ تمام صحابۂ کرام میں علم و فضل، زہد و تقویٰ میں ممتاز اور تمام سلاسل تصوف اسلامی کا سر چشمہ بھی ہیں۔ آپ بلند حوصلہ، اور نہایت جری و بہادر تھے۔ ضرارؓ بن ضمرہ کے مطابق آپ کی ہر بات فیصلہ کن 'اور ہر فیصلہ عدل وانصاف پر مبنی ہوتا تھا۔ ہر پہلو سے علم کے چشمے پھوٹتے تھے اور حکمت و دانائی ٹپکتی تھی۔ دنیا کی رعنائیوں سے بے نیاز، مگر رات کی تاریکیوں میں عابد و زاہد تھے۔ مفکر و عبرت پذیر تھے۔ سادہ لباس اور معمولی خوراک پسند تھی۔ غریبوں کو پہلو میں بٹھاتے، دینداروں کی تعظیم کرتے۔ طاقتور لوگ ان سے باطل کی طمع نہ کرتے اور کمزور انصاف سے مایوس نہ ہوتے تھے۔ رات کی تاریکی میں اپنی داڑھی ہاتھ میں لیئے مار گزیدہ کی طرح تڑپتے اور آنکھوں سے آنسو بہتے اور فرماتے: اے دنیا! کسی اور کو فریب دے، مجھ سے لگاوٹ نہ کر، میں نے تجھے تین طلاقیں دیدی ہیں۔ تیری عمر تھوڑی، تیرا مقصد حقیر ہے۔ ہائے سفر بہت طولانی ہے راستہ وحشت ناک اور زاد سفر مختصر ہے۔

حضرت علیؓ فطرۃً للہیت اور خلوص نیت کے پابند تھے۔ اصول اسلام اور اعمال دین ان کے خمیر کا جز تھے۔ آنحضرت ﷺ سے محبت اور اپنی ذات کا شعور، اسلام کی بصیرت اور اس کا تحفظ حاصل حیات تھا۔ تبلیغ اور حفاظت دین ان کا منصب و مقصد تھا۔ وہ ہر حالت میں اسی کام کیلئے وقف تھے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ نے بالادستی حاصل کرنے میں خونریزی 'اور خطرناک اختلافات کے امکانات دیکھے۔ تاریخ کے اس موڑ پر آپ کا غیر معمولی تدبر کام آیا۔ اور اسلام کو باہمی تصادم سے بچا کر اپنی صوابدید سے، تبلیغ و مشاورت سے قوت بخشی۔ قرآن مجید کی ترتیب وتدوین اور کتابت، حکام وقت کو اقدامات میں اپنی رائے سے مطلع کرنا، مقدمات میں اسلامی فیصلے اور ممکن حد تک قرآن وسنت کے نفاذ میں جد وجہد، آپ کی

سیاست کا جوہر ہے۔ دشمنوں پر لشکر کشی کے وقت انھوں نے مشورے دئے۔ فتوحات کے بعد مال غنیمت کی تقسیم میں فیصلہ کیا، مفتوحہ زمینوں اور نئے ٹیکسوں جیسے نئے معاملات میں قانون سازی کی۔ مقدمات میں فیصلے، مشکلات میں رہنمائی، سیاسی بحران میں مفاہمت اور اختلاف میں اتحاد کو فوقیت دی۔ ہر موقع پر ان کی رائے کو برتری حاصل رہی۔ حضرت علیؓ بیک وقت شمشیر آزما قائد و فاتح بھی تھے اور بے مثل خطیب و کاتب بھی، وہ قرآن مجید کے سب سے بڑے مفسر، اسلامی علوم کے مؤسس، مدرّس و شارح بھی ہیں اور کمال ایثار و جاں فروشی کے مظہر بھی۔ اخلاق و صفات، فکر و نظر، عقیدہ و عمل کی اس محیر العقول ذات کا یہ معجزہ ہے کہ آج تک تمام مسلمان بلا اختلاف انھیں حق و صداقت کا مجسمہ، اور ان سے عقیدت کو شرط اسلام جانتے ہیں۔

عوام کی شورش، جنگ کے ہنگامے، مخالفین کے منصوبے سامنے تھے لیکن حضرت علیؓ پہاڑوں سے زیادہ ثابت قدمی کیساتھ اپنی جگہ قائم تھے۔ وہ ادنی سی جانبداری، معمولی سے اشتعال، انتقام پسندی یا ناجائز پروپیگنڈہ کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ جنگ جمل میں اونٹ کے محاصرہ کے بعد حضرت ام المومنین کا سابقہ احترام برقرار رکھا۔ صفین میں فرات پر دشمن کا قبضہ اور پانی کی بندش، اور پھر فتح مندی کے بعد گھاٹ پر دشمنوں کو آنے جانے کی اجازت، آخری معرکہ میں قرآن مجید کے احترام میں جنگ بند کرنا، علوی سیاست کے وہ لاجواب کارنامے ہیں جن کے پیش نظر آپ کے تدبر کا بخوبی احساس ہوتا ہے۔ ان اقدامات نے اسلام کے انسانی حقوق و احترام کو جاودانی عطا کی، حضرت علیؓ کو دلوں کا فاتح قرار دیا۔ ان فیصلوں نے حضرت علیؓ کو انسانی ضمیر کی آواز مانا۔ الطبری، جاحظ، ابن عبد ربہ، ابنِ جِنّی، ابن مزاحِم، الیعقوبی، اور سید رضی نے حضرت علیؓ کے جو خطبے اور خطوط، اقوال اور ارشادات محفوظ کئے ہیں ان سے ابن ابی الحدید، محمد عبدہٗ، توفیق الفکیکی، جارج جورداق نے حضرت علیؓ کے سیاسی اور ریاستی تدبر کی داد دی ہے۔ اور جب تک تحقیق و مطالعہ کے مردان راہ حضرت علیؓ کے ان خطبات اور خطوط کو سیرت و تاریخ کے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے حضرت علیؓ کے مناصب روحانی، کمالات معنوی و دینی روشن سے روشن تر ہوتے جائیں گے۔

حضرت علیؓ کا مدینہ سے نقل مرکز ان کے سیاسی تدبر کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے حرمین کا احترام باقی رہا۔ اس اقدام نے ان پیش قدمیوں کو روک دیا جن سے منافقین و مخالفین کی ریشہ دوانیاں حرمین کے تقدس کو پامال کر سکتی تھیں۔ اس کی وجہ سے مخالفت کا شامی مرکز، ایران میں پروپیگنڈہ کے امکانات سے محروم ہو گیا۔ کوفہ سے عراق و ایران، اور مصر تک اسلامی اخلاق، اسلامی اقدار، اور اسلامی تعلیمات کا ضابطہ جاری کیا جو مدینہ میں رہنے سے نہ ہو سکتا تھا۔ اصول حکمرانیِ اسلام میں جن باتوں کو آپ نے بنیادی اہمیت دے کر فروغ بخشا وہ یہ تھے: عقیدۂ توحید، للہیت و تقوی، قرآن و سنت پر مبنی عدل و ایثار، جنگ سے بچاؤ کی سعی، اور جنگ کی حالت میں انسانی و اسلامی اقدار کی حفاظت، اسلامی معاشرہ و عقائد کی اشاعت، ان کا احیا و قیام، حاکم و محکوم میں

قربت، بالادستی میں ناجائز فوائد کے حصول کی روک تھام، کمزور اور شکست خوردہ لوگوں سے حسن سلوک، دولت اندوزی کا سدِّ باب، قانون شریعت کے نفاذ میں سستی اور غفلت کی ممانعت، ماضی کی یاد اور مستقبل کی تعمیر، عبادت و تقویٰ کا فروغ، اصول اخلاق میں راست بازی، رحم و شفقت، سخاوت، اور جہالت و غربت کے خلاف مسلسل جہد و جہد، تعلیم و تربیت میں، ہمدردی، انکسار و فروتنی، خود فراموشی وایثار وغیرہ۔ ان تمام مسائل کے لئے دیکھئے: امام حسنؓ کے نام وصیت نامہ، مالک بن اشتر کے نام مکتوب دستور، اور دیگر خطوط، (: نہج البلاغۃ ج ۲)۔

حضرت علیؓ کم و بیش چار سال نو مہینے، آٹھ دن اقتدار میں رہے۔ اس مدت میں انھوں نے سب سے پہلے گذشتہ بد نظمیوں کو دور کیا اور بد عنوانیوں کا قلع قلع کیا۔ تقسیم وظائف اور گورنروں کے تقرر کا نیا نظام جاری کیا۔ بیت المال کو مرکزی خزانہ قرار دے کر تنخواہوں اور وظیفوں کی بے اعتدالی ختم کی۔ پرانے گورنروں کی جگہ نئے گورنر مقرر کئے۔ متعدد محاذوں پر فوج بھیجی۔ مختلف علاقوں میں نگراں فوجی سردار، اور محصل متعین کئے۔

علمی آثار:

حضرت علیؓ کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے؛ "أنا دارُ الحكمة و عليٌّ بابها" میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ اور یہ بھی حدیث ہے: "أنا مدينةُ العلمِ و عليٌّ بابُها" میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ حقیقت میں آپ علوم کا سرچشمہ ہیں۔ آپ کی زندگی کا پورا زمانہ علم و عمل کی خدمت میں بسر ہوا۔ ہر وقت آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔ قرآن مجید کے سب سے بڑے حافظ و محافظ، اور عالم اور اپنے ملکۂ خداداد کی وجہ سے علوم دین کے مبلغ و معلم تھے۔ چنانچہ درج ذیل علمی آثار مرتب فرمائے۔ مثلاً:

قرآن مجید: حضرت علیؓ نے آیات اور سورتوں کو نزول کے اعتبار سے مرتب فرمایا اور قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں کی تفسیر بیان فرمائی۔

حدیث: مشہور ہے کہ آپ نے احادیث و قضایا و احکام قلم بند فرمائے تھے۔ اس مجموعہ کا نام "الصحیفۃ" تھا (البخاری۔ کتاب الفرائض) اس کے علاوہ ان سے احادیث کثیر تعداد میں مروی ہیں۔ بعض حضرات نے انھیں الگ بھی جمع کر کے "مسند علیؓ" نام رکھا ہے۔

خطبات و خطوط: صدر اوّل میں جس قدر خطبات و خطوط حضرت علیؓ سے مروی ہیں اور علمائے ادب نے جس قدر انھیں محفوظ رکھا ہے، اس کی مثال نہیں ہے۔ ان مجامیع و مفردات میں سب سے زیادہ شہرت عام پانے والے چند یہ ہیں: غرر الحکم و درر الکلم، : نہج البلاغۃ، کلمات قصار، عیون الحکم و اصول معاجز الکلم، دیوان امیر المومنینؓ، عجائب احکام و قضایا و مسائل امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ، الصحیفۃ العلویہ۔

''نہج البلاغۃ'' مرتبہ سید الشریف الرضی میں تقریباً ۲۳۶ خطبات، ۷۱ خطوط، ۴۸۰ کلمات جمع کئے گئے ہیں۔اس نے ادب عربی میں بے نظیر مقبولیت حاصل کی۔ اس کی سینکڑوں شرحیں عربی، فارسی، اردو، انگریزی وغیرہ میں چھپ چکی ہیں۔ نہج البلاغۃ کا سب سے قدیم مخطوطہ جو رضا لائبریری میں محفوظ ہے اس کو عربی فارسی اردو و انگریزی میں تحقیقی مقدمہ کے ساتھ رضا لائبریری نے مئی ۲۰۱۳ء میں شائع کیا ہے۔

رامپور رضا لائبریری میں موجود حضرت علیؓ کے آثار:

قرآن مجید:

ا۔ رضا لائبریری کے ان نادر نسخوں میں سب سے قدیم اور سب سے اہم امیر المومنین حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلی صدی ہجری کا کلام پاک ہے جو اونٹ کی کھال پر لکھا ہوا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ جن کو رسالت مآب ﷺ نے خود باب العلم کہہ کر پکارا ہے جنھوں نے بچپن سے لیکر وفات نبوی تک مکمل تیس سال حضور ﷺ کی خدمت و رفاقت میں بسر کئے تھے کاتبانِ وحی میں آپ کا نامِ نامی شامل ہے قرآن و حدیث سے اجتہاد اور مسائل کے استنباط میں آپ کو ید طولی حاصل تھا، خلفاء ثلاثہ بھی آپ سے مشورہ کرتے تھے۔ رامپور رضا لائبریری میں آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن پاک موجود ہے جس میں ۳۴۳ اوراق ہیں، کوفی رسم الخط میں اونٹ کی کھال پر لکھا ہوا ہے۔ سائز ۲۰ X ۲۸ سینٹی میٹر ہے۔ ہر ورق پر ۱۵ یا کہیں ۱۶ سطریں ہیں اور ہر دو ورق کے بیچ میں ہرن کی جھلّی لگائی گئی ہے تاکہ روشنائی آپس میں مل کر پھیل نہ سکے۔ اس مصحف شریف کے شروع میں حافظ محمد اسرائیل نقوی امروہوی کے لکھے ہوئے تقریباً سات 'تعارفی اوراق' شامل ہیں اس تعارف کو پڑھ کر اس نسخہ سے متعلق بہت سی اہم باتیں سامنے آتی ہیں۔ یہ تعارف ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۲ء میں لکھا گیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ قرآن شریف اصلاً نواب حامد علی خاں نواب رامپور (متوفی ۱۹۳۰ء) کے تبرکات امام باڑہ میں شامل تھا۔ اور یہ کلام اللہ نوادراتِ زمانہ اور عجائبات روزگار میں سے ہے۔ اور قدیم زمانہ کی طرزِ کتابت اور حسن خط پر ایک روشن دلیل ہے۔ زمانہ کی دست برد نے اس کی تکمیل میں نقصان پیدا کر دیا ہے اور بعض اوراق گم ہو گئے ہیں۔ اس بات میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ یہ مصحف ابتدائی دورِ اسلام کا لکھا ہوا ہے حسنِ خط اور خوبیِ کتابت اس کے ہر حرف سے نمایاں ہے بلکہ حدِّ اعجاز پر فائز ہے۔ کیا عجب کہ یہ خیال صحیح ہو کہ یہ حضرت علیؓ کے ہی دست مبارک کا لکھا ہوا ہو۔

بہر حال امیر المومنین حضرت علیؓ کے دست مبارک کی طرف منسوب یہ کلام پاک پندرہ سو سال قبل لکھے گئے قلمی نسخے کی شکل میں رضا لائبریری کی زینت ہے۔ اس قرآن پاک کو دیکھنا خود ایک بہت خوبصورت احساس ہے اس کو دیکھنے کی حسرت لئے دور دور سے زائرین آتے ہیں۔

(۱۱۹۰): نہج البلاغۃ

بہت مشہور کتاب جو ۴۰۰ ہجری اور ۱۰۱۰ عیسوی میں لکھی گئی اور جس کو عبدالجبار بن حسین بن ابی القاسم الحاجی الفارانی نے ۵۵۳ ہجری اور ۱۱۸۵ عیسوی میں کتابت کیا۔ اور خود انھوں نے اسکو فضل اللہ بن عبداللہ بن عبیداللہ الحسنی الراوندی کیساتھ اس پر نظر ثانی کی۔ یہ اچھی حالت میں اور مکمل ہے۔ سائز 25x10.5 اوراق کی تعداد 160-1/2 ہے۔ جو از ۸ الف تا ۱۶۹ الف ہیں۔ فی صفحہ ۲۵ سطریں ہیں۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ ابتدا یوں ہے:۔" اما بعد ! حمد الله الَّذِی جَعَلَ الحَمدَ ثَمناً لِنُعَمَائِہٖ۔" اس کی ایک کاپی علی گڈھ میں ہے جس کا نمبر ۱۲۷ ہے۔

(۱۱۹۳): نہج البلاغۃ

یہ مخطوطہ اچھی حالت میں ہے۔ تیرھویں صدی ہجری اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ اچھی حالت میں ہے۔ اور مکمل ہے۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ یہ کاپی نہایت خوبصورت اور مزیّن ہے اور صفحہ ۹۶ ب سے ۴۰۸ ب کے حاشیہ پر لکھا ہوا ہے۔ لائنوں کے درمیان میں فارسی ترجمہ بھی موجود ہے۔

(۱۱۹۶): نہج البلاغۃ

یہ نسخہ قدرے کرم خوردہ ہے۔ ۱۲۶۳ ہجری اور ۱۸۴۷ عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ مکمل ہے۔ اسمیں ۱۹۳ اوراق ہیں۔ اور سطریں ۱۹ فی صفحہ ہیں۔ اس کا سائز ۳۱،۸x۲۳ ہے۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔

(۱۱۹۷): نہج البلاغۃ

یہ نسخہ تیرھویں صدی ہجری اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے اور نامکمل ہے۔ اس میں ۴۸ اوراق ہیں اور فی صفحہ ۱۳۔۱۷ سطریں ہیں۔ رسم الخط عربی نسخ ہے۔ ابتدا یوں ہے: "وَمِن خُطبَۃٍ لَہٗ عَلَیہِ السَّلَام : اَیُّہَا الغَافِلُون غَیرِ المَغفُولِ عَنہُم"

(۱۱۹۸): شرح نہج البلاغۃ۔

یہ: نہج البلاغۃ کی شرح ہے۔ عزالدین ابو حامد عبدالحمید بن ھبۃ اللہ المداینی المعتزلی "ابن ابی الحدید" (متوفی ۶۵۶ ہجری مطابق ۱۲۵۸ عیسوی) اس کے شارح ہیں۔ جنھوں نے اس کو (۴۹۔۶۴۴ھ ۱۲۴۷-۵۱ء) کے درمیان مؤید الدین "ابن علقمی" (متوفی ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ عیسوی) کیلئے لکھا۔ رسم الخط نستعلیق ہے۔ سائز 33x23.8 ہے۔ اوراق 396-1/2 ہیں۔ جو ۳ ب سے ۳۹۹ ب تک ہیں۔ فی صفحہ 21 سطریں ہیں۔ یہ نسخہ نامکمل ہے۔ جلد اول (جزو نمبر ۱ تا ۱۰) پر مشتمل ہے۔ یہ کاپی بری طرح کرم خوردہ ہے۔ اور ۱۱ رویں صدی ہجری اور ۱۷ ویں صدی عیسوی کا کتابت کیا ہوا ہے اور ۱۰ خوبصورت لوح اور رنگین مذہب جدول سے سجایا گیا۔

اس کی ابتدا یوں ہے:۔ "اَلحَمدُ لِلّٰہِ الوَاحِدِ العَدلِ ۔اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی تَفَرَّدَ بِالکَمَال"

(۱۱۹۹) شرح: نہج البلاغۃ۔

یہ بھی : نہج البلاغۃ کی شرح ہے لیکن اس کے شارح نہیں معلوم۔ بری طرح کرم خوردہ ہے ۔ کتابت گیارھویں صدی ہجری اور سترھویں صدی عیسوی ہے ۔ سائز 24x16.5 ہے ۔ اور سطریں ۱۸ فی صفحہ ہیں۔ اور غلطی سے مصنف کے معاصر احمد بن ناصر کی طرف منسوب کردیا گیا ہے۔ حواشی بھی موجود ہیں۔

ابتدا یوں ہے: "اَلحَمدُ لِلّٰہِ الَّذِی نَجَّانَا مِن مَہَاوِی الغَیِّ وَظُلُمَاتِہٖ"

(۱۱۹۸)۔ شرح: نہج البلاغۃ

از عز الدین ابو حامد عبد الحمید بن ہبۃ اللہ المدائنی المعتزلی 'ابن ابی الحدید' (م ۶۵۶ھ ، ۱۲۵۸ء)۔ رسم الخط نستعلیق۔ سائز 33x23.8 ورق ۳۹۷، کتابت: (۴۹-۶۴۴ھ ، ۵۱-۱۲۴۷ء) برائے مؤید الدین ابن علقمی (م ۶۵۶ھ، ۱۲۵۸ء)، ۱۰ خوبصورت لوح مطلّا، مذہب۔ ابتدا: الحمد للہ الواحد العدل۔الحمد للہ الذی تفرّد بالکمال۔

(۱۱۹۹)۔ شرح: نہج البلاغۃ:

رسم الخط نستعلیق۔ سائز 24x16.5 ۔ ورق ۱۳۱۔ سطر فی صفحہ ۱۸۔

بری طرح کرم خوردہ۔ کتابت گیارھویں صدی ہجری و سترھوی صدی عیسوی۔ ابتدا: الحمد للہ الذی نجّانا من مہاوی الغیّ وظلماتہ۔

۱۱۹۵۔ وصایا امیر المومنین، ابن بابویہ القمی۔

(۱۱۹۳)۔ مأۃ کلمۃ (مکمل)

رسم الخط عربی نسخ۔ کتابت (۱۲۹۷ھ، ۱۸۸۸ء)، ورق ۶۲ تا ۶۹ کے حاشیہ پر فارسی ترجمہ کیساتھ فارسی رباعیات کی شکل میں ہے۔ ابتدا: الشرف عند اللہ بحسن الاعمال۔

(۱۱۹۳)۔ کلام امیر المؤمنین۔

رسم الخط عربی نسخ۔ مکمل اچھی حالت میں۔ زمانہ تیرھویں صدی ہجری و انیسویں صدی عیسوی۔ ورق ۶۹-۷۷ کے حاشیہ پر فارسی ترجمہ کے ساتھ۔ ابتدا: استعین علی العدل بحسن النیۃ۔

(1193)۔ کلام امیر المؤمنین۔

سائز 21x 35.5 ۔ ورق ا۔ از ۸۸ب تا ۸۹ الف۔ درمیان میں فارسی ترجمہ از اسعدی۔ ابتدا: بسم اللہ اشرف العبادۃ: الاخلاص والشہادۃ۔

(۱۲۱۰)۔ نور الابرار المبین:

از صدر الدین محمد بن غیاث الدین منصور بن صدر الدین محمد بن ابراہیم الشیرازی الطبیب (م ۱۵۵۵

۹۶۲ء)۔ کرم خوردہ و آب زدہ۔ مکمل۔ سائز 15x 20 ۔ ورق ۳۳۳۔ سطر فی صفحہ ۱۴۔ رسم الخط نسخ۔: نہج البلاغۃ و دُرَرُ الحکم سے منتخب وصایا۔ ورق اپر ۱۱۶۶ھ و ۱۷۵۳ء کا ایک نوٹ ہے اور تین مہریں ہیں۔

ابتدا: الحمد للہ الذی خلق الانسان بقدرتہ۔

عمدۃ الطالب فی انساب ابی طالب، ابی عتبہ، نزل الابرار فی فضائل الائمۃ الاطہار، مرزا محمد بدخشی، رسالہ فی بیان سرّ الشہادہ۔

مطبوعات عربی:

دیوان علیؓ (نمبر ۱۰۱)۔ فن نظم عربی، ۲۔ دیوان علیؓ و شرح مغلقاتہ: مولوی عبد القصیر۔ (کال نمبر ۱۰۲) فن شرح نظم عربی۔ ۳۔ الامام علی بن ابی طالب: شعرہٗ و حکمہٗ، شیخ احمد تیمور باشا۔ (تاریخ الخلفا عربی۔ کال نمبر ۳۰)

شمائلِ نبویؐ سے متعلق عربی اشعار اور وصلیاں:

اسی طرح حضرت علیؓ کے نوادرات میں یہ پچپن عربی اشعار بھی ہیں جو حلیۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے متعلق ہیں۔ یہ سلاست و روانی، عقیدت کی فراوانی، اسلوب کی طاقت اور جذبات کی شدّت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی خطاطی کے نمونے رضا لائبریری کے نادر و نایاب ذخیرۂ مخطوطات کا انمول خزانہ ہیں جو اب تک قارئین کی دسترس سے محروم ہیں۔ اِن وصلیوں پر خطّاط کا نام درج نہیں ہے۔ احقر نے کوشش کی ہے کہ شعر کا مفہوم بامحاورہ اور مؤثر طریقہ پر واضح ہو جائے۔ شمائل ترمذی میں درج حلیۂ نبوی سے متعلق روایات کو بھی مدّ نظر رکھا جائے تو ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

وصلیوں کا ترجمہ:

تقریباً ۱۵۔۱۶ برس پہلے کی بات ہے جب میں رضا لائبریری کے کیٹلاگ رس روم میں اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا درگاہ مکن پور سے متعلق مغلیہ فرامین پر اپنا کام کر رہا تھا جو کہ اب دو جلدوں میں مکمل اور طباعت کے لئے تیار ہے۔ ایک روز اچانک سابق او ایس ڈی ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی مرحوم میرے پاس آئے۔ اس وقت میرے سامنے کی سیٹ پر مرحوم و مغفور سید احمد فنان و خطاط (مصنف 'خط کی کہانی تصویروں کی زبانی') اپنی میز پر حضرت علیؓ کی اِن وصلیوں کی کیٹلاگنگ کا کام کر رہے تھے۔ اور یہ پچپن وصلیاں ان کی میز پر ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ صدیقی صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ ''ان کو ذرا پڑھئے کیا لکھا ہوا ہے''۔ ایک دو کو پڑھوا کر ان کا مطلب پوچھا پھر گویا ان پر وجد سا طاری ہو گیا۔ خوش ہو کر مجھ سے کہا کہ ''آپ اِن تمام وصلیوں کا اردو میں ترجمہ کر ڈالئے تو ایک بہت بڑا کام ہو جائے گا''۔

چنانچہ میں نے ان پر کام شروع کر دیا۔ ایک وصلی سید صاحب سے لے لیتا اور کام کر کے انھیں واپس کر دیتا۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ سارا کام مکمل ہو گیا۔ جو میں نے ٹائپ کر کے وقار الحسن۔ صدیقی صاحب

کے حوالہ کر دیا۔ انھوں نے اس کو پڑھا اور میری پیٹھ تھپتھپائی اور اشاعت کا وعدہ کیا۔ افسوس کہ پھر ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اہم کام طاق نسیاں کی نذر ہو کر طباعت سے محروم رہا۔

یہاں پر اِن اشعار کے مضامین کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

اِن اشعار کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسن میں زبردست ملاحت شامل تھی اور آپ کا جمال دلوں کو مسخر کر لیتا تھا۔ جب آپ جلوہ افروز ہوتے تو چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی۔ آپ نہایت موزوں قد و قامت والے تھے اور اکلوتی چال کے مالک تھے یعنی اس چال میں کوئی ہمسری نہیں کر سکتا تھا۔ آپ کا سر مبارک بڑا اور زلفیں رات کی طرح سیاہ تھیں اور بال اتنے گھنے ملیح اور پر کشش تھے کہ جن کی نظیر نہیں مل سکتی۔ مخلوقات میں سب سے زیادہ ملیح و خوبصورت آپ ہی کی ذات تھی۔ اور آپ کے بال کنگھی کئے ہوئے تھے گھنگھریالے اور چھوٹے نہ تھے۔ سیاہ تھے اور بیحد پیارے لگتے تھے۔ آپ کے بالوں کے پٹھے کانوں کی لو سے آگے نہیں جاتے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ سینہ پر بالوں کی ایک لکیر تھی جس کی ابتدا اوپر کی طرف سے گلے سے ہوتی تھی اور نیچے کی جانب ناف پر ختم ہوتی تھی۔ سینہ مبارک اور دونوں شانے خوبصورت کشادہ تھے۔ بالوں سے سینہ مبارک خوبصورت لگتا تھا اور بالوں کی کثرت سینہ کے اگلے اور درمیانی حصے پر تھی۔ اسی طرح آپ کے بازو اور شانے بھی خوبصورت و حسین تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں مکمل سیاہ تھیں جو دلوں کو مسخر کر لیتی تھیں اور حاسدین کے بھی ہوش اڑا دیتی تھیں۔ وہ روشن معتدل طور پر بڑی اور چشمہ کی مانند نہایت پر کشش تھیں۔ چشمہ تو صرف زمین کو نفع بخشتا ہے جبکہ وہ آنکھیں تمام مخلوقات کو حسن اور فیض بخشتی ہیں۔ چشمہ کا فائدہ صرف پھلوں تک محدود ہے جبکہ ان مقدس آنکھوں کا فیض تمام مخلوقات کیلئے عام ہے۔ سراپا حسن، مکمل سفید، سفیدی میں سرخی شامل۔ دست مبارک سخاوت میں فراخ، قدم مبارک کشادہ، شب معراج عرش پر پہنچنے والے جن کے نیچے دنیا و آخرت کی ساری بلندیاں حاصل ہوتی ہیں۔ آپ اتنے خوبصورت اور نورانی تھے کہ عشاق پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چلتے تو تیز چلتے گویا نشیب کی طرف پانی بڑھ رہا ہے۔ پیشانی مبارک چوڑی، بھنویں کمان کی طرح، دونوں بھنویں جدا جدا تھیں۔ پیشانی مبارک پر دونوں بھنوؤں کے درمیان ایک رگ تھی جو بسا اوقات غصہ کے وقت ابھر آتی تھی۔ بینی مبارک خوبصورت اور قدرے بلند جس کا اگلا حصہ قدرے مرتفع، کان اتنے حسین جو کسی نے نہ سنے نہ دیکھے، ریش مبارک گویا تاریکی میں نور تھی۔ آپ کی ذات بابرکت ہر جاندار کے لئے رحمت تھی۔ دونوں رخسار مبارک گداز تھے جن سے نور پھوٹتا تھا۔ تمام خوبیاں آپ کے چہرۂ مبارک میں جمع تھیں، منھ قدرے کشادہ جن سے نکلا ہوا ہر لفظ نعمت، دندان مبارک بھی کشادہ جن میں نور ہی نور تھا۔ گردن مبارک ساری مخلوق کی گردنوں سے اچھی، خوبصورتی میں چاند، جس میں عزت کے ہار تھے۔ اعضائے مبارک مضبوط اور موزوں، چال سراپا رحمت، اور درمیانہ چال چلتے تھے جو حسن کی تکمیل کرتی تھی۔ بازو لمبے۔ اور اخلاق و عادات میں اعتدال تھا۔ آپؐ کا وصف بیان کرنا کوئی کھیل نہیں کیونکہ آپ کی وضع قطع کا کوئی ثانی نہیں ہے اور راقم الحروف ہاشمی

"آپ کے غم فراق سے چور ہے جو آپ کے عُلوِّ مرتبت سے ناواقف اور اپنی کوتاہ فہمی کا معترف ہے۔اللہ ہی آپ کی شان کو بہتر جانتا ہے۔وہی آپ کے بیان سے پوری طرح واقف ہے۔اے پروردگار اس راقم کی کمیوں کو دور فرمادے اور اپنے فضل سے اس کے گناہوں کو معاف فرمادے۔(آمین)۔

ان اشعار میں بیان کردہ سراپائے رحمت کتب حدیث وسیرت میں بیان کردہ تفصیلات سے قریب تر ہے۔اور ان میں جذبات کی شدت، تشبیہات کی ندرت، اور شعری استعارہ کا حسن بھی شامل ہے نیز شعری حسن کو نثری پیرایہ میں منتقل بھی نہیں کیا جاسکتا البتہ اس کے نفس مضمون یا مفہوم کو ضرور بیان کیا جاسکتا ہے۔کیا بعید ہے کہ یہ اشعار جو حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہیں واقعی آپ کے زور قلم کا نتیجہ ہوں پھر تو ان کے حسن زبان وبیان کی لطافت کا کیا کہنا کیونکہ حضرت علیؓ سے زیادہ حضور کی معرفت کسے تھی۔حضرت صاحب دیوان شاعر تھے اور آپ کا دیوان مطبوعہ ہے۔خطاط نے اپنے فن خوشنویسی کا پورا زور صرف کرکے ان میں چار چاند لگادئے ہیں۔یقیناً یہ وصلیاں رامپور رضا لائبریری کا ایسا بیش بہا خزانہ ہیں جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

یہ وصلیاں بہت بڑے سائز میں بہت خوبصورت انداز میں لکھی گئی ہیں۔خطاط نے اپنا نام تو نہیں دیا ہے لیکن جس طرح اس نے کمالِ خط کے جوہر دکھائے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ہر شعر کے اوپر درود پاک (صلی علیہ الہنا) بھی لکھا ہے۔میں نے طغرائی شکل میں نہایت ساحرانہ وفنکارانہ طور پر لکھے گئے ان شعروں کی مشکل عبارت کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔اور جس قدر سمجھ سکا اس کو اردو میں منتقل کردیا۔جواب مکمل طور پر کتابی شکل میں طباعت کے لئے تیار ہے۔ان وصلیوں میں خطاط نے ہر شعر کا فارسی ترجمہ بھی شامل کیا ہے جو بہت ہی باریک قلم سے ہر مصرع کے نیچے سرخ روشنائی سے دیا ہوا ہے۔

ذیل میں ان اشعار کا متن اور اردو ترجمہ دیا جارہا ہے :

متن اشعار مع اردو ترجمہ

قَرْنُ الْمَلَاحَۃِ حُسْنُہٗ وَالْحُسْنُ صَارَ قَرِیْنُہٗ

آپ ﷺ کے حسن میں ملاحت شامل تھی اور حسن سے آپ کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

صَادَ الْقُلُوْبَ جَمَالُہٗ شَاعَ الْآفَاقَ جَلَالُہٗ

آپ ﷺ کا جمال دلوں کو شکار کرتا تھا۔اور آپ کا جلال آفاق پر چھایا ہوا تھا۔

وَالْبَدْرُ یَقْصُرُ نُوْرُہٗ اِذَا مَا اسْتَبَانَ ظُھُوْرُہٗ

جب آپ ﷺ جلوہ افروز ہوتے تو چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی۔

مَرْبُوْعُ قَدٍّ کَاَنَّہٗ وَاللّٰہُ اَعْظَمُ شَأْنَہٗ

گو آپ ﷺ میانہ قد وقامت والے تھے۔پر قسم اللہ کی بڑی شان والے تھے۔

لٰکِنْ یُّطَاوِلُ جَارَہٗ وَھُوَ الْمُفِیْضُ بِجَارِہ

اپنے پڑوسیوں پر جود و کرم کی بارش فرماتے اور اپنی (سخاوت) کے دریا بہاتے تھے

قَدْ کَانَ یُعْلِیْہِ الصَّمَدْ اِذْ مَایُمَاشِیْہِ اَحَدْ

آپؐ کی رفتار میں اگر کوئی آپ کی ہمسری کرتا تو خدائے بے نیاز آپؐ کو اس پر بالاتری عطا فرماتا۔

وَالْحُسْنُ کَانَ لِقَامَتِہٖ وَالْعَظْمُ کَانَ لِہَامَتِہٖ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سر مبارک بڑا تھا اور قد و قامت نہایت خوبصورت تھی۔

فَاضَ الْعَجَائِبَ بَحْرُہٗ کَاللَّیْلِ سُوْدٌ شَعْرُہٗ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زلفیں رات کی طرح سیاہ تھیں اور آپؐ (کے علم) کا سمندر عجائبات پیش کرتا تھا (اشارہ ہے آیت یعلم الکتاب والحکمۃ کی طرف)

رَجُلاً مَلِیْحاً فِی الْوَریٰ شَعْرُ الْحَبِیْبِ تَکَثُّراً

حبیب پاک کے بال اتنے گھنے تھے کہ (اس کی وجہ سے) مخلوقات میں آپ سب سے زیادہ حسین و جمیل نظر آتے تھے۔

سُوْدٌ وَدُوْدٌ لَاسَبَطْ شَعْرٌ مُّشَیَّطٌ لَاقَطَطْ

آپؐ کے بال کنگھی کئے ہوئے تھے، گھنگریالے نہ تھے۔ کالے تھے بہت بھلے لگتے تھے چھوٹے نہ تھے

لَیْسَتْ تُجَاوِزُ شَحْمَتَہٗ اِذْ مَایُوَقِّرُ جُمَّتَہٗ

آپؐ کے گھنے بال اگر آپ کے وقار میں اضافہ کرتے تھے تو وہ کانوں کی لو سے آگے نہیں جاتے تھے۔

وَھُوَ الْمُبَارَکُ کَوْنُہٗ قَدْ کَانَ اَزْھَرُ لَوْنُہٗ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رنگ بہت کھلتا ہوا تھا۔ اور آپؐ کی ہستی نہایت مبارک و مسعود تھی

کَبُرَتْ وُجُوْہُ مَرَامِہٖ عَظُمَتْ رُوؤُسُ عِظَامِہٖ

آپ کی ہڈیوں کے کنارے بڑے تھے اور آپ کے مقاصد عظیم تر تھے۔

اَعْلیٰ حُدُوْدِہٖ نَحْرُہٗ کَالْخَطِّ یَجْرِیْ شَعْرُہٗ

آپؐ کے (سینہ پر) بالوں کی ایک لکیر تھی جس کی ابتدا اوپر کی طرف حلق سے ہوتی تھی۔

لِلنَّاظِرِیْنَ مُسَرَّہْ أسْفَلُ حُدُوْدِہٖ سُرَّہْ

اور اس کی انتہا نیچے کی طرف ناف پر ہوتی تھی جو دیکھنے والوں کو خوشی و مسرت سے ہمکنار کرتی تھی۔

عَرُضَتْ وَرُفِعَتْ قَدْرُہٗ اَلْمَنْکِبَانِ وَصَدْرُہٗ

آپؐ کے دونوں شانے اور سینہ مبارک کشادہ تھے اور آپؐ عالی قدر ہستی تھے۔

لَا کُلَّہٗ بَلْ صَدْرُہٗ بِالشِّعْرِ زُیِّنَ صَدْرُہٗ

آپؐ کا سینہ مبارک بالوں سے آراستہ تھا لیکن پورا سینہ نہیں بلکہ اگلا اور درمیانی حصہ

وَالْمَنْکِبَانِ بِسِرْبِہٖ أیْضاً ذِرَاعَاہُ بِہٖ

آپؐ کے دونوں بازو اور کشادہ شانے بھی اسی طرح بالوں سے آراستہ تھے۔

اَلَّلحْظُ صَارَ کُلُوْبَنَا عَیْنَاہُ صَادَ قُلُوْبَنَا

آپؐ کی آنکھیں ہمارے دلوں کو شکار کرتی تھیں اور آپؐ کی نگاہ سے ہمارے زخم بھر جاتے تھے

كُمُلَ السَّوَادُ سَوَادُهَا لِلْحَاسِدِيْنَ حُصَادُهَا

آپؐ کی آنکھیں مکمل سیاہ تھیں جو (اپنے حسن کی وجہ سے) حاسدوں کو بھی زیر کر دیتی تھیں۔

اَلْعَيْنُ عَيْنٌ بِالنَّظَرْ بَلْ كَانَ عَيْنَاهُ ذَا قَدَرْ

آپؐ کی آنکھیں بظاہر چشمہ کی مانند لگتی تھیں پر حقیقت میں چشمہ سے زیادہ حسین و جمیل تھیں

عَيْنٌ مَّضِئٌ مُّرْتَفَعْ عَيْنٌ مَّلِئٌ مُّشَفَّعْ

آپؐ کی دونوں آنکھیں روشن اور بڑی اور دراز تھیں (یا سفارش کرنے والی تھیں)۔

اَلْعَيْنُ تَنْفَعُ فِي الثَّرىٰ عَيْنَاهُ حَسَّنَتِ الْوَرىٰ

چشمہ تو صرف زمین کو نفع بخشتا ہے جبکہ آپ کی آنکھیں تمام مخلوقات کو حسن و زیبائی سے سرفراز کرتی تھیں۔

عَيْنَاهُ تُحْيِ ذَا النَّظَرْ اَلْعَيْنُ تَنْفَعُ فِي الثَّمَرْ

آپؐ کی آنکھیں ہر اہل نظر کو زندگی بخشتی تھیں جبکہ چشمہ صرف پھلوں کے لئے مفید ہے۔

أَيْضاً بَيَاضُہٗ قَدْ كُمُلْ وَالْحُسْنُ فِيْهِ مُشْمَلْ

آپ مکمل طور پر گورے چٹّے تھے جس میں حسن و جمال کی آمیزش تھی۔

قَدْ شَاعَ فِيهَا حُمْرَهْ لِلنَّاظِرِيْنَ مُسَرَّهْ

آپؐ کا گورا رنگ سرخی مائل تھا جسے دیکھ کر ناظر باغ باغ ہو جاتا تھا۔

لِلْجُوْدِ وَسِعَ كَفُّہٗ كُلٌّ بَخِيْلٍ كَفُّہٗ

جود و سخاوت میں آپ کا ہاتھ اس قدر فراخ تھا کہ ہر بخیل کو بھی آپ کی سخاوت سے حصہ ملتا ہے۔

قَدَمَاهُ أَيْضاً وَاسِعاً فِي الْعَرْشِ لَيْلاً رَافِعاً

آپؐ کے پاؤں مبارک بھی کشادہ تھے جن کو (شب معراج میں) عرش تک رسائی کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔

مِنْ تَحْتٍ كَانَتْ رِفْعَه وَالْعَيْنُ ذَاتُہٗ رِفْعَه

آپؐ کے قدموں کی برکت سے ہی بلندی ہے اور آپؐ کی ذات اقدس بہت ہی عالی قدر ہے۔

قَدْ كَانَ اَبْيَضَ مَشْرِبَا وَلِعَاشِقِيْهِ مُطْرِبَا

آپؐ اپنے مشرب و مسلک اور رفتار و گفتار کے لحاظ سے بھی اتنے محبوب تھے کہ آپؐ کے عاشقوں پر وجد و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

اِنْ كَانَ يَمْشِي يَنْتَدِرْ فَكَانَ صَبَباً يَّنْحَدِرْ

آپؐ اس قدر تیز رفتاری سے چلتے تھے کہ گویا پانی ڈھلوان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

بِالْوُسْعِ كَانَ جَبِيْنُہٗ فِي الْعِشْقِ كَانَ حَبَّتُہٗ

آپؐ کی پیشانی مبارک چوڑی تھی اور آپ کا دل ہمیشہ (اللہ تعالیٰ کے) عشق میں ڈوبا رہتا تھا۔

قَدْ كَانَ يَفْرَحُ خَاطِبُہٗ كَالْقَوْسِ كَانَ حَوَاجِبُہٗ

آپؐ کی بھنویں کمان کی طرح تھیں جسے دیکھ کر مخاطب کو خوشی حاصل ہوتی تھی۔

لَيْسَتْ تُقَارِنُ تَتَّصِلْ كَانَتْ سَوَابِغُ تَنْفَصِلْ

دونوں بھنویں جدا جدا تھیں۔ آپس میں ملی ہوئی نہیں تھیں۔

فِي الْبَيْنِ كَانَ مَكَانُہٗ عِرْقٌ تَبَارَكَ شَانُہٗ

آپؐ کی پیشانی پر ایک شاندار بابرکت رگ تھی جو دونوں بھنوؤں کے درمیان تھی۔

لَا فِي مَلَاحَةِ فَيْضِہٖ كَانَتْ تَدُرُّ بِغَيْظِہٖ

غصّہ کے وقت وہ رگ ابھر آتی تھی نہ کہ سخاوت ونرمی کے وقت۔

أَقْنٰی أَشَمَّ صِفَاتُہٗ وَالْأَنْفُ حَسُنَتْ ذَاتُہٗ

آپؐ کی بینی مبارک خوبصورت اور تنگ نتھنے والی اور درمیان سے بلند تھی۔ آپؐ کامل ترین صفات کے حامل تھے

وَالسَّمْعُ مِثْلُہٗ مَا سَمِعَ عِرْنِيْنُہَا قَدِ ارْتَفَعَ

ناک کا سخت حصہ اٹھا ہوا تھا۔ اور کان اتنے حسین تھے کہ ویسے کہیں سننے میں نہیں آئے۔

يُسْبِي قُلُوْبَ الْعَاشِقِيْنَ يَعْلُوْہٗ نُوْرٌ بِالْيَقِيْنِ

آپ (کے چہرۂ انور) پر یقیناً ایسا نور تھا جو عاشقوں کے دلوں کو گرفتار کر لیتا تھا۔

أَلْوَانُہَا بَدْرُ الدُّجیٰ قَدْ فَاقَ لِحْيَتُہٗ اللُّحیٰ

آپؐ کی ریش مبارک جبڑے سے آگے نکلی ہوئی تھی اس کی رنگت تاریکی میں ماہِ کامل جیسی اچھی لگتی تھی۔

وَلِكُلِّ نَفْسٍ رَحْمَتُہٗ أُسُّ الْمَحَاسِنِ نِعْمَتُہٗ

آپؐ کے احسانات نے ساری خوبیوں کی اساس رکھی۔ اور آپ کی ذات اقدس ہر جاندار کے لئے سراپا رحمت ہے۔

وَالنُّوْرُ بِہِمَا قَدْ نَزَلَ قَدْ كَانَ خَدَّاہُ السَّہْلُ

دونوں رخسارِ مبارک نرم وگداز تھے جن سے نور پھوٹتا تھا۔ یا جن پر نور کی بارش ہوتی تھی۔

مَلَأَ الْوَرٰی بِمَكَارِمِہٖ كُلُّ الْمَحَاسِنُ فِي فَمِہٖ

آپؐ کے دہن مبارک میں تمام خوبیاں جمع تھیں تمام مخلوقات آپؐ کے احسانات کے زیر بار ہیں۔

فِي كُلِّ لَفْظٍ نِعْمَتُہٗ فِي فِيْہِ كَانَتْ وُسْعَتِہٖ

منھ قدرے کشادہ تھا جس سے نکلا ہوا ہر لفظ نعمت ہوتا تھا۔

وَالنُّوْرُ بِہِمَا امْتَزَجْ أَسْنَانُہٗ قَدِ انْفَرَجْ

آپؐ کے دندانِ مبارک بھی کشادہ تھے جن میں نور کی آمیزش تھی۔

فِي الْحُسْنِ كَانَ تَزِيْدُہٗ فَاقَ الْخَلَائِقَ جِيْدُہٗ

آپؐ کی گردن مبارک ساری مخلوق کی گردنوں سے اچھی تھی جو حسن میں بے پناہ اضافہ کا سبب تھی

فِيْہَا قَلَائِدُ عِزَّہٗ كَانَتْ صَفَاءً كَفِضَّہْ

جو چاندی کی طرح چمکتی تھی، جس میں عزت کے ہار ٹکے ہوئے تھے۔

قَدْ أُحْكِمَتْ أَعْضَائُہٗ قَدْ اَتْلَفَتْ أَعْدَائَہٗ

آپ کے اعضاء مبارک مضبوط اور موزوں تھے۔ جنھوں نے آپؐ کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔

أَلْمَاءُ يَنْبُوْ عَنْہُمَا قَدْ كَانَ وَطْئُہٗ مَرْحَمَا

پانی آپ کے قدموں سے (خوبصورتی کی وجہ سے) دور رہتا تھا۔ آپؐ کی رفتار سراپا رحمت تھی۔

وَالْمَشْيُ كَانَ تَكَفِّياً لِلْحُسْنِ كَانَ مُوَفِّياً

آپؐ درمیانی چال سے چلتے تھے جس میں بڑی زیبائی اور الفت و دلفریبی تھی

قَدْ طَالَ زَنْدُ حَبِيْبِنَا مِنْہٗ صَلَاحُ قُلُوْبِنَا

حبیب پاک کے (ہاتھ کے) گٹّے لمبے تھے جن سے ہمارے دلوں کی صلاح وابستہ ہے۔

قَدْ كَانَ خُلُقُہٗ يَعْتَدِلٗ وَالْحُسْنُ فِيْہِ مُشْمَلٗ

آپؐ کے اخلاق و عادات میں اعتدال تھا اور آپ کے ذات بے پناہ حسین تھی۔

لَيْسَ الْہَزَالُ بِوَصْفِہٖ لَاسَہْمَ فِيْہِ بِوَضْعِہٖ

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصف بیان کرنا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے کیونکہ آپ کی وضع قطع کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

وَالْہَاشِمِيُّ مُتَكَلِّمٌ مِنْ هِجْرِہٖ مُتَأَلِّمٌ

ہاشمی (اشارہ خود حضرت علیؓ کی طرف) جو آپؐ کی نعت بیان کر رہا ہے آپؐ کی جدائی میں غم زدہ ہے۔

عَنْ ذَرْوِ وَاصِفِہٖ جَاهِلٗ وَبِقَصْرِ فَہْمِہٖ قَائِلٗ

آپؐ کا وصف بیان کرنے والا آپؐ کے علوّ مرتبت سے ناواقف ہے۔ اس کو اپنی کوتاہ فہمی کا اعتراف ہے

أَللّٰہُ يَعْلَمُ شَأْنَہٗ هُوَ الْعَلِيْمُ بَيَانَہٗ

اللہ ہی آپؐ کی شان سے واقف ہے اور آپؐ کی تعریف و توصیف کرنا اُسی کے بس کی بات ہے۔

يَا رَبِّ صَحِّحْ سُقْمَہٗ بِالْفَضْلِ دَمِّرْ جُرْمَہٗ

اے پروردگار! اِس راقم کی کمی کو دور فرمادے اور اپنے فضل سے اس کے گناہوں کو معاف فرمادے۔

اعظم گڑھ میں اردو صحافت اور مطابع

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنفین
azmi408@gmail.com

اعظم گڑھ اپنی مردم خیزی اور گراں قدر علمی، ادبی، تنقیدی، تعلیمی اور تاریخی خدمات کے لئے ادبی دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔ خاص طور سے علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں مصنفین اعظم گڑھ کو خصوصی امتیاز حاصل رہا ہے۔ اس کی خاک سے اٹھ کر بے شمار ارباب کمال سپہر علم و ادب پر نیر اعظم بن کر چمکے، جن کے علم و فضل، تبحر اور علمی و ادبی کمالات کا دانشوروں نے برملا اظہار و اعتراف کیا ہے۔ البتہ یہ ایک افسوس ناک پہلو ہے کہ اعظم گڑھ کی علمی و ادبی خدمات اور اردو زبان و ادب کے ارتقاء، عہد بہ عہد ترقیوں اور تبدیلیوں کا جائزہ اب تک نہیں لیا گیا، حالانکہ اعظم گڑھ کے اہل علم اور ارباب شعر و ادب نے مختلف شعبوں میں گراں قدر اور نہایت عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔

خاک اعظم گڑھ سے جنم لینے والے شیدائیان علم و ادب نے دوسرے میدانوں کے ساتھ صحافت کے میدان میں بھی سنگ میل قائم کیا، ممتاز صحافی پیدا کئے، جنہوں نے اس حیثیت سے پوری دنیا میں صحافت کا نام روشن کیا۔ ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) ایم اے او کالج سے وابستہ ہوئے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے انہیں ماہنامہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزینکے شعبہ اردو کی ادارت کی ذمہ داری سونپی جسے انہوں نے ۱۸۹۸ء تک بخوبی ادا کیا۔ بعد ازاں وہ تحریک ندوہ سے وابستہ ہوئے اور اس کا ترجمان ماہنامہ الندوہ جولائی ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا تو مئی ۱۹۱۲ء تک اس کی ادارت کا فریضہ انہیں نے انجام دیا۔ ایک کم عرصے میں الندوہ نے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ - ۱۹۵۸ء)، مولانا عبدالسلام ندوی (۱۸۸۳ - ۱۹۵۶ء)، مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ - ۱۹۵۳ء)، مولانا عبداللہ عمادی (م: ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء) وغیرہ نے علمی و ادبی صحافت کا آغاز الندوہ ہی کے صفحات سے کیا۔ بعد میں مولانا آزاد نے جب الہلال جاری کیا تو مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی اس کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ علامہ شبلی کے علاوہ متعدد ایسے اہل علم اور باکمال صحافی گذرے ہیں جو اگرچہ اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھے، لیکن ان کا دائرہ کار ملک کے دوسرے علاقوں میں رہا اور انہوں نے علمی و ادبی صحافت کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

جس طرح اعظم گڑھ کے صحافیوں کی خدمات کی علاحدہ کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی اسی طرح اعظم گڑھ

میں اردو صحافت کن مراحل سے گذری اور اس کی تاریخ کیا ہے؟ سرے سے اس کا بھی ذکر نہیں ملتا۔ اس مضمون میں اعظم گڑھ میں آغاز سے بیسویں صدی کے وسط تک اردو صحافت کے بکھرے نقوش کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اعظم گڑھ نسبتاً ایک نیا ضلع ہے۔ ۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے اسے ضلع بنایا۔ اس سے پہلے وہ مختلف عہد میں سرکار جون پور اور غازی پور وغیرہ کا حصہ رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی علمی و صحافتی تاریخ کا ایک حصہ ان اضلاع اور ریاستوں کی تاریخ کا بھی اہم حصہ ہے۔

آفتاب ہند (ہفتہ وار): اعظم گڑھ میں اردو صحافت کا آغاز فروری ۱۸۸۶ء میں ہفتہ وار اخبار آفتاب ہند کی اشاعت سے ہوا۔ جو شہر اعظم گڑھ کے محلہ معتبر گنج (نزد سرکاری شفاخانہ) سے جاری ہوا تھا۔ چار صفحات پر مشتمل یہ اخبار دوشنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کا سالانہ چندہ تین روپیہ تھا۔ اس کے مالک قدرت علی خاں لکھنوی تھے۔[1] ہفتہ وار آفتاب ہند مطبع آفتاب ہند میں طبع ہوتا تھا۔ گویا ہفتہ وار آفتاب ہند کا اپنا مطبع تھا۔ نادر علی خاں نے اپنی کتاب ہندوستانی پریس[2] میں اس مطبع کا ذکر نہیں کیا ہے حالانکہ انہوں نے ضلع اعظم گڑھ کے درج ذیل مطابع کا ذکر کیا ہے:

۱۔ مطبع نیر اعظم: مطبع نیر اعظم ہندوستان کے نامور ترین مطبع نول کشور لکھنؤ کی اعظم گڑھ میں ایک شاخ کے طور پر قائم ہوا۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ جون ۱۸۶۷ء میں منشی نول کشور (۱۸۳۶-۱۸۹۵ء) نے شہر اعظم گڑھ کے محلہ پہاڑ پور میں اپنا مطبع قائم کیا تھا۔ یہ مطبع انہوں نے خان بہادر مولوی حافظ عبدالعزیز صدر الصدور کی فرمائش پر شیخ باسو کے مکان میں قائم کیا تھا۔ یہ اگرچہ مطبع نول کشور کی شاخ تھا مگر اس کا نام اس سے جدا اور نیر اعظم تھا۔ کتابوں میں صرف اس کے قیام کی تفصیل لکھی گئی ہے اس کی خدمات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔[3] امیر حسن نورانی نے منشی نول کشور پر اپنی کتاب میں ان کے مطبع کی جن شاخوں کا ذکر کیا ہے اس میں لاہور، کان پور، اجمیر اور جبل پور کی شاخوں کا ذکر ہے، مگر اعظم گڑھ کی شاخ کا نام درج نہیں ہے۔[4]

۲۔ مطبع محمدی: یہ ریٹائرڈ تحصیل دار نجف خاں کے مکان میں ۱۸۷۷ء ۱۸۷۸ء میں قائم ہوا۔ اس کے مالک

---

[1] امداد صابری، تاریخ صحافت، ناشر مولانا اسرار الحق کوٹہ راجستھان، ب۔ت۔، حصہ سوم، ص ۴۳۰
[2] مطبوعہ اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء
[3] نادر علی، ہندوستانی پریس، اردو اکادمی لکھنو، ۱۹۷۲. ص ۱۳۔
[4] امیر حسن نورانی، علمی اجالے، راجہ رام کمار بک ڈپو لکھنو، ۱۹۵۹. ص ۱۰۲

شیخ محمد خاں اور لیاقت علی صاحبان تھے۔اس کے کاتب غلام علی تھے۔یہ معلومات نادر علی خاں کی کتاب سے دستیاب ہوئی ہیں۔

۳۔ مطبع عزیزی: یہ محلہ پہاڑ پور میں محمد علی خاں تحصیل دار کے مکان میں قائم تھا۔اس کے کاتب بھی غلام علی ہی تھے۔اس کا اجراء ۱۸۷۷ء میں ہوا تھا۔

۴۔ مطبع الہامیہ: ۱۳۱؍اکتوبر ۱۸۸۷ء کو قائم ہوا۔یہ غالباً مولوی الہام علی موہانی کا مطبع تھا۔

۵۔ مطبع آفتاب: یہ ۱۸۹۵ء میں قائم ہوا۔[۵]

ان کے علاوہ اعظم گڑھ کی تاریخ میں مہتاب پریس، ملت پریس، احسن پریس اور اتحاد پریس کے نام بھی ملتے ہیں جو انیسویں صدی کے اواخر میں قائم ہوئے[۶] اور طباعت و اشاعت اردو کی خدمات انجام دیں۔ مگر ان کی تفصیلات دستیاب نہیں۔ اسی طرح مالکان مطابع شیخ باسو محلہ پہاڑ پور، خان بہادر مولوی حافظ عبدالعزیز صدر الصدور، نجف خاں، شیخ محمد خاں، لیاقت علی اور محمد علی خاں کے حالات اور خدمات کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ غلام علی ایک سے زاید مطابع کے کاتب تھے۔ان کا ذکر بھی کہ وہ کہاں کے باشندے تھے اور انھوں نے کہاں سے خطاطی سیکھی اور کب تک کام کیا وغیرہ کچھ معلوم نہیں۔

شہر اعظم گڑھ کا ایک قدیم محلہ باز بہادر ہے جو کوٹ قلعہ سے ملحق ہے۔اس کے مغربی حصہ کو محلہ کاتبان بھی کہا جاتا تھا۔اس میں کثرت سے خطاط اور خوش نویس آباد تھے۔ہم نے بچپن میں نامور خطاط مولوی عبدالغفار صاحب مرحوم کو دیکھا ہے، جو کسی زمانے میں دارالمصنّفین اور معارف کے خطاط تھے، اور اپنی منفرد خطاطی کے لئے معروف تھے۔ان کے خانوادے کے مولوی انوار احمد اور دیگر خطاط بھی یہاں بود و باش رکھتے تھے۔ہمارے دوست مولانا جاوید احمد قاسمی امام و خطیب جامع مسجد دلال گھاٹ مولوی عبدالغفار کے صاحبزادے ہیں، ان کا قاسمی پریس اور ان کے بڑے والد ڈاکٹر عبدالقادر (م: ۱۹۷۱ء) کی نشانی قادری پریس اسی محلہ باز بہادر گلی کاتبان میں قائم ہے۔

ہفتہ وار خورشید: آفتاب ہند کے اجراء کے ڈیڑھ سال بعد ۱۳؍اکتوبر ۱۸۸۷ء کو ہفتہ وار خورشید جاری ہوا۔ جو ہر پنج شنبہ کو شائع ہوتا تھا۔ اس کے مالک، ایڈیٹر اور کاتب مولوی الہام علی موہانی تھے۔ اخبار کا اپنا مطبع ''الہامیہ'' تھا جو اپنے مالک کے نام کی طرف منسوب تھا۔ سولہ صفحات کے اس ہفتہ وار اخبار کا سالانہ چندہ

---

[۵] ہندوستانی پریس، ص ۳۱

[۶] شاہ افضال اللہ قادری، تاریخ اعظم گڑھ، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،، ۲۰۱۰، ص ۱۱۵

تین روپیہ تھا۔[۷] نادر علی خاں نے اپنی کتاب ہندوستانی پریس میں اس مطبع کا ذکر کیا ہے۔ البتہ تاریخ اعظم گڑھ کے مصنف حاجی شاہ افضال اللہ نے اس کا نام اپنی فہرست میں درج نہیں کیا ہے۔ ہفتہ وار خورشید کے ایڈیٹر الہام علی موہانی کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ البتہ نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غالباً حسرت موہانی کے ہم وطن اور موہان ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے۔

لبرل: ہفتہ وار خورشید کے بعد ۱۸۹۵ء میں ہفتہ وار اخبار لبرل جاری ہوا۔ اس کا مقصد حکومت اور رعایا کی خیر خواہی کے ساتھ انشاپردازی بھی تھا۔[۸] قدرت علی خاں اس کے ایڈیٹر تھے۔ تلاش و جستجو کے باوجود نہ اخبار کا کوئی شمارہ ملا اور نہ مدیر کے حالات معلوم ہوئے۔ یہ مطبع آفتاب ہند اعظم گڑھ میں چھپتا تھا۔ آٹھ صفحات کا اخبار تھا۔ سالانہ چندہ چھ روپیہ تھا۔[۹] اردو صحافت پر لکھی جانے والی متعدد کتابوں فہرست اخبارات ہند از مولوی محبوب عالم (۱۸۶۲-۱۹۳۷ء)، ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور، صحافت کی ایک نادر تاریخ، تاریخ صحافت حصہ سوم از امداد صابری (۱۹۱۴-۱۹۸۸ء) وغیرہ میں اخبار لبرل کا ذکر ملتا ہے۔

ماہنامہ معارف: اعظم گڑھ میں علمی صحافت کا آغاز ماہنامہ معارف کے اجراء سے ہوا۔ یہ جولائی ۱۹۱۶ء میں دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے ترجمان کی حیثیت سے نکلا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ پوری علمی، دینی، ادبی اور تاریخی دنیا کا اپنا ترجمان تھا۔ یہ اس کے مؤسس اور بانی کا اخلاص تھا کہ معارف اب تک بلاناغہ جاری ہے۔ شاید ہی ملک کا دوسرا رسالہ اس قدر طویل مدت سے پابندی سے نکل رہا ہو اور شوق کی نگاہوں سے پڑھا جاتا ہو۔ علامہ اقبال سے لے کر ڈاکٹر حمید اللہ تک باوقار اہل علم وادب کا ایک بڑا طبقہ گذشتہ ایک صدی سے نہ صرف اس سے وابستہ رہا بلکہ اس کی انفرادیت کا معترف بھی رہا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴-۱۹۵۳ء)، علامہ شبلی (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) کے عزیز ترین شاگرد اور جانشین تھے۔ ماہنامہ الندوہ لکھنؤ (اجراء: جولائی ۱۹۰۴ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸ء) کے الہلال کلکتہ (اجراء: ۱۳؍ جولائی ۱۹۱۲ء) کے اسٹاف میں رہ چکے تھے۔ ادارت کا انہیں بڑا تجربہ اور سلیقہ تھا، چنانچہ معارف کو انہوں نے اس آب وتاب کے ساتھ نکالا کہ وہ خود آپ اپنی نظیر بن گیا۔ ۱۰۷ برس یعنی ایک صدی سے زاید مدت گذر جانے کے باوجود معارف کی کوئی دوسری مثال نہیں پیش کی جاسکی ہے۔

معارف ایک علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔ اس کا آغاز شذرات (اداریہ) سے ہوتا ہے اور پھر سر مقالہ اپنے

---

[۷] تاریخ صحافت، حصہ سوم ص ۵۰۳

[۸] مولوی محبوب عالم، فہرست اخبارات ہند، کارخانہ پیسہ اخبار لاہور، ۱۹۰۴، ص ۶۸

[۹] تاریخ صحافت، حصہ سوم ص ۴۸۰

موضوع پر انتہائی تحقیقی مقالے کو بنایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں اخبار علمیہ، آثار علمیہ و تاریخیہ، تبصرۂ کتب، معارف کی ڈاک اور مطبوعات جدیدہ جیسے اہم کالم ہوتے ہیں جو اپنی انفرادی اہمیت اور انتہائی معلومات افزا ہونے کے سبب بے حد مقبول ہیں۔ معارف دراصل ہماری تاریخ کا وثیقہ بلکہ ایک اہم بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے ہندوستان کی علمی، ادبی، دینی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تمام احوال مل جائیں گے۔

ہندوستان بالخصوص مسلمانان ہندوستان بیسویں صدی میں کن کن نشیب و فراز سے گذرے۔ زبوں حالی اور تنگ دامانی کے کن کن مراحل اور مسائل کا انہوں نے سامنا کیا اور ان پر کیا گذری۔ اس کی تمام تفصیل معارف کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ اسی طرح ہماری علمی و ادبی تاریخ کے تمام اہم پہلو تسلسل کے ساتھ معارف کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ بیسویں صدی میں لکھی جانے والی ہزاروں کتابوں کی تفصیلات معارف کے صفحات کی زینت ہیں۔ یہ تمام تاریخی تفصیلات، دیگر رسائل میں بھی جستہ جستہ مل سکتی ہیں تاہم ہندوستان کے مختلف شہروں اور علاقوں سے جو علمی، ادبی، دینی رسائل اور اخبارات نکلے اور پھر ناقدری کی نذر ہو گئے، ان کا ذکر بھی معارف کے صفحات میں مل سکتا ہے، گویا صحافت کی بیسویں صدی کی تاریخ کے لئے معارف کے علاوہ کہیں اور شاید ہی اس قدر مواد مل سکے۔

غرض مختلف حیثیتوں سے معارف ایک بے نظیر علمی رسالہ ہے۔ اس کے بانی مدیر مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (۱۹۰۳-۱۹۷۴ء) مدیر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے (۱۹۱۱-۱۹۸۷ء) نے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (۱۹۰۷-۱۹۷۹ء) کے ساتھ اسے جاری رکھا اور اس کے معیار و وقار پر حرف نہیں آنے دیا۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو یہ ذمہ داری مولانا ضیاء الدین اصلاحی (۱۹۳۷-۲۰۰۸ء) کو تفویض کی گئی وہ بھی اپنی وفات (۲ر فروری ۲۰۰۸ء) تک بزرگوں کی اس علمی یادگار کو توانائی بخشتے رہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے انتہائی پرآشوب دور میں معارف کے اس کے بلند معیار اور علمی و قار کے ساتھ باقی رکھا۔ ان کے بعد یہ علمی پرچہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی ادارت میں ستمبر ۲۰۲۱ تک شائع ہوا۔ اب اس کی ادارت کے فرائض ڈاکٹر ظفرالاسلام خان اور مولانا عمیر الصدیق ندوی انجام دے رہے ہیں۔ امید ہے علامہ شبلی کے تخیل اور مولانا سید سلیمان ندوی کی اس علمی یادگار کا سلسلہ قائم رہے گا۔

العلم چریا کوٹ: معارف کے ساتھ ہی خطہ مشرق کے یونان و شیراز یعنی چریا کوٹ سے ماہنامہ العلم اگست ۱۹۱۶ء میں جاری ہوا۔ معارف ایک صدی بعد بھی جاری ہے لیکن العلم چند شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ اس کے مدیر جواہر سخن کے مؤلف مولانا ابوالمعالی محمد مبین عباسی کیفی چریا کوٹی (م: ۱۴ر اکتوبر ۱۹۵۶ء) تھے۔ اگست ۱۹۱۶ء کے سرورق سے اس کے مؤسس کی حوصلہ مندیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھا ہے کہ اردو،

فارسی، عربی، عبرانی، برج بھاشا کا ماہانہ رسالہ ادب، معانی و بیان، تمدن، اخلاق، تاریخ، تفسیر، فقہ، کلام، فلسفہ، تصوف، ریاضیات و ہئیات اور نجوم کا دلچسپ مجموعہ۔"[۱۰] پہلے شمارے کی جو فہرست ہے اس سے بھی اس کے تنوع کا اندازہ ہوتا ہے۔ افسوس العلم شعلۂ مستعجل ثابت ہوا۔

سہیل: ۱۹۳۲ء میں شہر اعظم گڑھ سے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل جاری ہوا، اور کئی برس تک بڑی شان سے نکلتا رہا۔ اس میں علاقائی اور ملکی خبروں کے ساتھ علمی و ادبی مضامین و مقالات بھی شائع ہوتے تھے۔ اعظم گڑھ کے شعراء کا کلام بالخصوص تلمیذ شبلی علامہ اقبال سہیل (۱۸۸۴-۱۹۵۵ء) اور مولوی محبوب الرحمن کلیم کی غزلیں اس میں شائع ہوتی تھیں، جس کی وجہ سے یہ اخبار کافی مقبول ہوا۔ اس کے مالک اور مدیر محمد سلیم صاحب مرحوم تھے، تاہم پس پردہ اصل مدیر مشہور اہل قلم اور مصنف مولوی عبدالباری ابو علی اثری (۱۹۰۳-۱۹۹۳ء) تھے۔ وہی اس کے اداریے لکھتے، خبریں اور تبصرے لکھتے، بلکہ ادارت اور نامہ نگاری کے تمام فرائض بھی وہی انجام دیتے۔

سہیل کے چند سیاسی تبصرے بہت مقبول ہوئے، مولوی ابو علی اثری اگرچہ مولانا ابوالکلام آزاد کے زبردست شیدائی تھے تاہم ان کے دو قومی نظریہ سے اتفاق نہیں رکھتے تھے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ کے بڑے حامی تھے اور اس کی حمایت میں بڑے بڑے معرکہ آراء مضامین لکھے۔ ان کے اس نقطۂ نظر کا اظہار ہفتہ وار اخبار سہیل میں شائع ان کے بعض مضامین سے بخوبی ہوتا ہے۔ اخبار سہیل کی فائلیں اب دستیاب نہیں، محض ایک نامکمل اور کرم خوردہ فائل مولوی ابو علی اثری کے پاس محفوظ تھی جو اب ان کے صاحبزادے جناب ارشد علی انصاری کی تحویل میں ہے۔ اخبار سہیل کے مالک محمد سلیم صاحب نے، جو مجاہد آزادی شاہ افضال اللہ قادری (۱۹۰۱-۱۹۹۱ء) کے والد تھے، ملت پریس قائم کیا تھا۔ اخبار سہیل اسی میں طبع ہوتا تھا۔ یہ پریس مجاہد آزادی شاہ افضال اللہ قادری کو ورثے میں ملا تھا مگر اسے انہوں نے جدوجہد آزادی کی نذر کر دیا اور چلا نہ سکے۔ دراصل جدوجہد آزادی میں اس پریس کا بھی حصہ ہے۔ انگریزی حکومت کے خلاف متعدد مواقع پر اس سے پمفلٹ شائع ہوئے، اس کی پاداش میں اس پر پابندی لگی۔

ہفتہ وار ملک: ۱۹۳۲ء میں "ملک" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جناب محمد نقی قریشی نے جاری کیا تھا۔ نقی قریشی صاحب بزرگ صحافی اور ملک میں انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔ یہ اخبار انہوں نے انگریزی حکومت کی تائید و حمایت کے لئے جاری کیا تھا، اس لئے حکومت کے رویے کی تعریف و تحسین اور کانگریس پر سخت تنقیدیں کرتے، خبریں اور مضامین بھی اپنے مذاق کے مطابق شائع کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان

---

[۱۰] سرورق ماہنامہ العلم چریاکوٹ۔ اگست ۱۹۱۶ء

ندوی نے اس کے ۲؍ جون ۱۹۳۲ء کے شمارہ کا تعارف ماہنامہ معارف میں کراتے ہوئے لکھا:

ملک کی موجودہ سیاسیات میں اس کی روش حکومت کی تائید اور کانگریس پر سب و شتم ہے۔ حکومت کی تائید میں ضلع کے مختلف مقامات پر جو جلسے ہوئے ہیں ان کی مفصل روداد شائع کی جاتی ہے۔ نیز مقامی بورڈوں کے معاملات میں بھی حصہ لیتا ہے۔ ہفتہ وار خبریں اپنے مذاق کی شائع کی جاتی ہیں۔

شہر اعظم گڑھ میں کچہری روڈ پر اس کا دفتر تھا۔ اس کی اب کوئی فائل یا شمارہ دستیاب نہیں اور نہ کسی اور ذرائع سے اس سے زیادہ معلومات دستیاب ہو سکیں کہ اس کا پہلا شمارہ کب شائع ہوا اور پھر یہ اخبار کب تک جاری رہا؟۔ یا اسی طرح یہ معلوم نہیں کہ محمد نقی قریشی کون تھے؟ کاش اس کی کوئی فائل دستیاب ہو جاتی تو اس وقت کے اعظم گڑھ کو سمجھنے میں مدد ملتی۔ اعظم گڑھ کی تاریخ میں اب تک ہم لوگوں نے مجاہدین آزادی کے قصے پڑھے ہیں، ان کے حالات ملتے تو ایک ایسے کا فراد کے حالات بھی پڑھنے کو ملتے جس کو قوم وملت کی کوئی پروا نہیں تھی۔

ماہنامہ الاصلاح: جنوری ۱۹۳۶ء میں دائرہ حمیدیہ سرائے میر سے علامہ حمید الدین فراہی (۱۸۶۴-۱۹۳۰ء) کے شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی (۱۹۰۴-۱۹۹۷ء) کی ادارت میں ماہنامہ الاصلاح جاری ہوا۔ اس رسالے کا بنیادی مقصد فکر فراہی کی ترویج و اشاعت کے ساتھ ان کے غیر مطبوعہ مسودات کی طبع و اشاعت تھا۔ بلاشبہ یہ اپنے معیار و مذاق کے لحاظ سے ایک منفرد رسالہ تھا۔ محض چار برس شائع ہوا مگر اس نے دیرپا اثرات مرتب کئے۔ قرآن، حدیث، تفسیر اور زبان و ادب پر اچھے مضامین اور تحقیقی مقالات شائع ہوئے، سیرت شبلی اولاً اسی کے صفحات میں بالاقساط علامہ اقبال سہیل کے قلم سے چھپی۔ بعض نئے اہل قلم نے اس کے صفحات پر قلم پکڑنا سیکھا۔ اس کی تفصیل مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے اپنے کتابچہ ''الاصلاح۔ ایک تعارف'' میں قلم بند کی ہے۔ اس میں انہوں نے جو تفصیلات قلم بند کی ہیں ان سے اور باتوں کے سوا اس کے اثرات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ کتابچہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر نے شائع کیا ہے اور دستیاب ہے۔

ماہنامہ سرشار: ۱۹۳۶ء ہی میں ایک اور رسالہ ماہنامہ ''سرشار'' ممتاز شاعر رشید ذکی مچھلی شہری کی ادارت میں نکلا۔ ۵۶؍ صفحات کے اس رسالہ کی سالانہ قیمت تین آنہ تھی۔ یہ اعظم گڑھ کی ادبی تاریخ میں پہلا ادبی رسالہ تھا جو باقاعدہ نکلا۔ بڑے اہتمام سے نظمیں، غزلیں اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے۔ مزید تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ مثلاً ۱۹۳۶ء کے کس ماہ میں پہلا شمارہ شائع ہوا اور کب تک شائع ہوتا رہا۔ کون لوگ اس کی مجلس ادارت ومشاورت اور مالکان میں تھے وغیرہ۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ماہنامہ معارف میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

اعظم گڑھ کی مردم خیز سرزمین اخبارات و رسائل کے لحاظ سے شودر واقع ہوئی تھی لیکن ادھر دو ایک

برسوں سے اس کا مذاق پیدا ہو چلا ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ دو سال سے ایک ہفتہ وار اخبار سہیل کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ حال میں اس کے کارکنوں کے اہتمام میں ایک ماہنامہ رسالہ سرشار نکلا ہے جو ادبی رسائل کی طرح اپنے اندر عام دلچسپی کا کافی سامان رکھتا ہے ہم کو امید ہے کہ وہ مشرقی اضلاع میں مقبول ہوگا۔"[۱۲]

تذکرہ: قصبہ مئو، جو اب الگ ضلع بن چکا ہے، ۱۹۸۸ تک اعظم گڑھ کا ایک قصبہ تھا۔ یہاں سے ۱۹۳۱ء میں تذکرہ کے نام سے مولانا حبیب الرحمن الاعظمی محدث (۱۹۰۱-۱۹۹۲) نے ایک دینی رسالہ جاری کیا جس میں قرآن، حدیث، تفسیر کے متعلق مضامین شائع ہوتے۔ ۳۲ صفحات کے اس رسالہ میں غزلیں اور نظمیں بھی شائع ہوتیں، علمی خبریں بھی درج کی جاتیں"[۱۳]۔ یہ ایک عمدہ رسالہ تھا مگر چند شماروں کے بعد بند ہوگیا۔ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی اس کے مدیر تھے۔ ان کے عہد شباب کی امنگوں کا یہ نمونہ تھا۔ افسوس کہ اس کا کوئی شمارہ دستیاب نہ ہوسکا۔

اعظم گڑھ کی اردو صحافت پر غالباً یہ پہلا مقالہ ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے وسط تک کے پرچوں اور مطابع کا استقصاء کیا گیا ہے۔ نقش اول میں جو کمیاں ہوتی ہیں وہ اس میں بھی ہیں۔ یقین ہے آئندہ اس میں قیمتی اضافہ ہوگا۔

[۱۲] معارف اکتوبر ۱۹۳۶ء، ص ۳۰۹-۳۱۰

[۱۳] ماہنامہ معارف جنوری ۱۹۳۱ء، ص ۶۸

مولانا ابوالکلام آزاد کا ادراک معانی قرآن

ترجمان القرآن کے حوالے سے

ڈاکٹر جسیم الدین

شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

jasimqasmi@gmail.com

مولانا آزاد کا دماغ ترجمہ و تفسیر، دین وفقہ، آثار وسیرت، ادب وشعر، تاریخ وفلسفہ، سیاست ومعیشت اور فکر وفن کے خزائن کا خزانہ تھا۔ قدرت نے جدید وقدیم علوم کے باب میں ہندوستان میں اتنا بڑا آدمی پیدا نہیں کیا۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا حق ادا کر دیا، کیوں کہ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شخصیت کی جتنی بھی جہات ہیں، ہر جہت ریسرچ کی مستحق ہے۔ لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور ہنوز لکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔

''ترجمان القرآن'' مولانا ابوالکلام آزاد کی شہرۂ آفاق ترجمہ و تفسیر ہے۔ مولانا سے پہلے قرآن پاک کے جتنے بھی تراجم اردو میں منظر عام پر آئے، وہ عربی آیات کے الفاظ کا تحتانی ترجمہ تھے، یعنی جس ترتیب سے سورہ کے الفاظ ہیں اسی ترتیب سے الفاظ کے نیچے ان کا ترجمہ درج کیا گیا۔ ان ترجموں میں الفاظ کے لغوی معنٰی کا التزام تو بیشک کیا گیا، لیکن اس طرح نہ تو کلام پاک کا زور پیدا ہوتا اور نہ وہ دلنشینی ابھرتی ہے جو قرآن پاک کی دعوت کا سحر ہے۔ مولانا نے اس روش کو یکسر ترک کر دیا۔ مولانا اردو زبان کے پہلے مترجم ومفسر ہیں جنھوں نے قرآن کا ترجمہ قرآن ہی کے الفاظ میں اس شان وشوکت سے کیا کہ داغ کا وہ شعر بامعنٰی ہو گیا:

ورنہ قرآن بھی آتا بہ زبان اردو	احمد پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور

اللہ نے قرآن فہمی کے باب میں مولانا آزاد کو خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ وہ زمانے کے مسائل کا واحد حل قرآن کو سمجھتے تھے اور انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے تھے۔ ان کے ترجمہ اور تفسیر کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ اپنے اندازِ بیان میں قرآن کے اسلوب کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ محض الفاظ کے لغوی ترجمہ پر اکتفانہ کر کے عربی زبان وادب اور مقصدِ قرآن کو پیش کرتے ہیں، جس سے قرآن کا شکوہ اور الٰہی کلام کی شان وشوکت برقرار رہتی ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ اور تفسیر میں قرآن کا لہجہ اختیار کیا اور عربی آیات کو اردو کا جامہ پہنا دیا۔ اس سے پہلے یہ سحر کسی دیگر ترجمہ و تفسیر میں نہیں ہے۔ مولانا نے اپنی تفسیر اور ترجمے میں مسلمانوں کے ذہنی محرکات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے قرآن ہی کی زبان استعمال کی ہے، جس سے قرآن کی

کشش قائم رہتی ہے اور قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ اردو میں قرأت کر رہا ہے۔ مولانا کے ترجمے سے قرآن کی دعوت کا تاثر اہل اردو پر سحر کرتا ہے اور عربی آہنگ قائم رہتا ہے۔ جو لوگ عربی نہیں جانتے، وہ خود کو عربی فضا میں محسوس کرتے ہیں۔ شورش کاشمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح ''ابوالکلام آزاد'' میں لکھا ہے:

مولانا کے ترجمہ و تفسیر نے برادران وطن میں بھی قرآن پڑھنے کی ترغیب پیدا کی۔ اس سے پہلے وہ قرآن کو نہ پڑھتے اور نہ اس پر غور کرتے تھے۔ اکا دکا پنڈت یا گیانی مناظرے یا مجادلے کے لیے قرآن پڑھتے تھے، لیکن مولانا کے ترجمہ و تفسیر کی ہمہ گیری نے تعلیم یافتہ برادران وطن، سکھوں، عیسائیوں میں اس کے مطالعہ کا ذوق پیدا کیا، جس سے ان کی نئی نسلوں اور بعض پرانے لوگوں میں اسلام آشنائی کی راہیں کھلیں اور وہ اسلام کے بارے میں جن بدگمانیوں کا شکار تھے، رفع ہو گئیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ترجمان القرآن کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ''مولانا کے ترجمان القرآن سے پہلے اردو میں کوئی ترجمہ ایسا نہیں تھا جو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کے دلوں کو بھینچ سکے''۔ اس لحاظ سے مولانا کا ترجمہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر بجائے خود اس دعوت کا احیا ہے جو غیر مسلموں پر مسلمانوں کے سیاسی طرز عمل سے بند ہو گئی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اسلام میں نا مسلموں کے لیے کوئی کشش نہ رہی، بلکہ الٹا تنفر پیدا ہو گیا۔[1]

ڈاکٹر ذاکر حسین لکھتے ہیں:

مولانا (ابوالکلام آزاد) کی زبان اور ان کے بیان میں غضب کی وہ دلکشی ہے جس نے ان کے ترجمے اور تفسیری اشارات میں اردو ادب کے ایک شاہکار کی شان پیدا کر دی ہے۔ مولانا روح تفسیر کے محرم ہیں، اور کلام الٰہی کے مطالب کو اس حکیمانہ انداز میں سمجھاتے ہیں جس سے نئے زمانے کے تنقیدی ذہن کو بھی تسکین ہو جاتی ہے۔[2]

شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

سورہ فاتحہ کی تفسیر میں مخاطبت کے لیے مولانا نے نئے زمانے کے اس ذہن کو بہ طور خاص ملحوظ رکھا اور اکثر و بیشتر وقت کے بعض سوالوں کا جواب آ گیا ہے۔ فی الجملہ وہ تمام الجھاؤ رفع ہو جاتے ہیں جو اس دور کی

---

[1] شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، مطبوعات چٹان، لاہور، ۲۰۰۹، ص: ۳۱۴

[2] ماخذ سابق، ص: ۳۱۴

عقلی اور علمی تحریکوں نے پیدا کیے۔[۳]

''ترجمان القرآن'' میں ہر سورہ کے ساتھ مطالب کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے، جس سے اس کے مضامین کا اجمالی تعارف ہو جاتا ہے۔ مولانا نے سورہ فاتحہ کی نہایت مفصل اور مطول تفسیر کی ہے جو تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ پھر اهدنا الصراط المستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے ''ہدایت'' کے چار درجات: ہدایت وجدانی، ہدایت حواسی، ہدایت عقلی اور وحی الٰہی سے مستنبط ہدایت کا بیان کرنا اور وحی الٰہی کی فوقیت کو مضبوط دلائل سے ثابت کرنا خاصا اہم ہے۔ قرآن حکیم مولانا کے غور و فکر کا سب سے اہم ماخذ تھا۔ انہیں قرآن حکیم سے ایک طویل رفاقت حاصل تھی۔ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں: ''کامل ستائیس برس سے قرآن میرے شب و روز کے فکر و نظر کا موضوع رہا ہے، اس کی ایک ایک سورہ، ایک ایک مقام، ایک ایک آیت، ایک ایک لفظ پر میں نے وادیاں قطع کی ہیں اور مرحلوں پر مرحلے طے کیے ہیں، تفاسیر و کتب کا جتنا مطبوعہ و غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا بڑا حصہ میری نظر سے گذر چکا ہے اور علوم قرآن کے مباحث و مقالات کا کوئی گوشہ نہیں، جس کی طرف حتی الوسع ذہن نے تغافل اور جستجو نے تساہل کیا ہو''۔[۴]

شورش کاشمیری نے مولانا کے ترجمہ و تفسیر اور قرآن دانی سے متعلق جو سوال و جواب مولانا ظفر علی خان سے کیا، اسے شورش نے اپنی کتاب میں یوں نقل کیا ہے:

عرض کیا، ''کیا مولانا ابوالکلام تفسیرِ قرآن میں اسلاف کے پیرو اور اس عہد کے مجتہد ہیں؟''۔ فرمایا: ''بالکل، اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کے باب میں انہیں خاص ملکہ عطا کیا ہے۔ وہ زمانہ کی فکری تحریکوں کو بخوبی سمجھتے اور قرآن کو ہر زمانے کی پیچیدگیوں کا حل قرار دے کر انسانی معاشرے کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ قرآن کی ابدی دعوت پر نظام کائنات کی اساس رکھتے ہیں۔ ان پر بفضلِ ایزدی علم القرآن کے دروازے اس طرح کھلے ہیں کہ ان کے لیے کوئی سی راہ مسدود و منقطع نہیں۔ اُن کی آواز قرآن کی آواز ہے۔''

راقم: ''مولانا کے ترجمہ و تفسیر میں بڑی خوبی کیا ہے؟ اور کون سا پہلو ہے جو دوسرے تراجم اور تفاسیر کے

---

[۳] ماخذ سابق، ص: ۳۱۴

[۴] مولانا ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی ۱۹۸۹، جلد اول، ص: ۵۱، ۵۲

مقابلے میں منفرد ہے؟"

مولانا: "اُن کے ترجمہ و تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قرآن ہی کی زبان میں خطاب کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ان کے الفاظ الوہیت اور نبوت کا جامہ پہنے ہوئے ہیں اور یہ صرف اللہ کی دین ہے۔ دوسرے تراجم جو اب تک ہندوستان میں ہوئے ہیں، وہ قرآن کے الفاظ میں لغوی ترجمہ ہیں، ان میں قرآن کے شکوہ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ عربی الفاظ کا ترجمہ اردو الفاظ میں کیا گیا ہے، مطالب کی طاقت و پہنائی او جھل ہو گئی ہے۔ آزاد کی تفسیر محض مقامی و محض اسلامی نہیں، بین الاقوامی و بین المللی ہے۔ وہ الہیاتی زبان میں کائنات کو خطاب کرتے ہیں۔"[۵]

خورشید احمد صدیقی مولانا کے فہم قرآن کے حوالے سے کہتے ہیں: "مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنہوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا"۔[۶]

مولانا آزاد قرآن حکیم کے حوالے سے تین کام کرنا چاہتے تھے:

۱۔ مقدمہ تفسیر البصائر: اس کتاب میں مولانا قرآن کریم کے مطالب و مقاصد پر اصولی مباحث لکھنا چاہتے تھے جس کا ایک حصہ انہوں نے لکھا اور وہ شائع بھی ہوا، مگر وہ نامکمل ہے۔

۲۔ البیان فی مقاصد القرآن: اس کتاب میں مولانا کے پیش نظر ایک مکمل و مفصل تفسیر تھی جس کو مولانا اپنی سیاسی مصروفیات کی بنا پر مکمل نہ کر سکے اور لکھا ہوا حصہ بھی ضائع ہو گیا۔

۳۔ ترجمان القرآن: قرآن حکیم کے حوالے سے مولانا کی یہی کتاب معروف ہوئی ہے۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

قرآن کے درس و مطالعہ کی مختلف صورتیں ہیں اور میں نے انھیں تین کتابوں میں منقسم کر دیا ہے: مقدمۂ تفسیر، تفسیر البیان اور ترجمان القرآن، مقدمۂ تفسیر قرآن کے مقاصد و مطالب پر اصولی مباحث کا مجموعہ ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ مطالب قرآنی کے جوامع و کلیات مدون ہو جائیں، تفسیر البیان نظر و مطالعہ کے لیے ہے اور ترجمان القرآن قرآن کی عالم گیر تعلیم و اشاعت کے لیے.......... اس کی ترتیب سے مقصود یہ ہے کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لیے ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے، جس میں کتب تفسیر کی سی تفصیلات تو نہ

---

۵ شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص: ۴۸۳

۶ پروفیسر رشید احمد صدیقی، ہم نفسان رفتہ، سرسید بک ڈپو، جامعہ اردو علی گڑھ، ۱۹۸۲، ص: ۱۱۴

ہوں، لیکن وہ سب کچھ ہو، جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینے کے لیے ضروری ہے، اس غرض سے جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، امید ہے کہ اہل نظر اس کی موزونیت بیک نظر محسوس کرلیں گے۔[۷]

مولانا کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ انہیں تفسیر قرآن لکھنے کے زمانے میں سیاسی مسائل کی وجہ سے متعدد بار جیل کی ہوا بھی کھانا پڑی۔ اس دوران ان کے مسودات تفسیر ضائع بھی ہوئے۔ متعدد دفعہ تفتیش کے نام پر حکام نے انھیں ضبط کیے۔ مگر مولانا نے ہمت نہ ہاری۔ مولانا کی زندگی میں تفسیر کا مقدمہ، تفسیر سورہ فاتحہ اور پہلی دو جلدیں شائع ہوگئی تھیں، جب کہ تیسری جلد ان کی وفات کے بعد ان کے مسودات سے مرتب کی گئی ہے۔

ترجمان القرآن کی خصوصیات:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ''ترجمان القرآن'' وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔ مولانا کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ایک اہم علمی تحفہ ہے۔ بطور خاص اس کا ترجمہ تو بہت پر کشش ہے ہی، اس ترجمہ پر خود مولانا کو بھی فخر تھا۔ ترجمان القرآن کی خصوصیت کا اندازہ مولانا کے اس اعلان سے بھی ہوتا ہے کہ وہ اسے انگریزی اور فرانسیسی زبان میں فوری طور پر منتقل کرنے کے متمنی تھے۔ ان کے سامنے اس کے فارسی، ترکی اور پشتو میں ترجمے کا منصوبہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ چاہتے تھے کہ بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل، تیلگو اور سندھی ترجمے ہو جائیں اور ہندی رسم الخط میں بھی اس کی اشاعت ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا نے تفسیر و ترجمہ محض مسلمانوں کی ضرورت کے لیے نہیں کیا بلکہ ان کے پیش نظر دیگر مذاہب کے لوگ تھے اور وہ انھیں بتانا چاہتے تھے کہ قرآن کی دعوت کسی ایک ملت یا امت ہی کے لیے نہیں، بلکہ ہر انسان اس کا مخاطب ہے۔

''ترجمان القرآن'' کے بارے میں مشاہیر کی آرا:

ترجمان القرآن کی علمی حیثیت کو علامہ سید سلیمان ندوی واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' نے پیدا کیا اور جس اسلوب بلاغت، کمال انشا پردازی اور زور تحریر کے ساتھ انھوں نے انگریزی خواں نوجوانوں کیسامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا، اس نے ان کے لیے ایمان ویقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری

---

[۷] ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۹، جلد ۱، ص: ۴۷۔۴۸۔

طرح نمایاں کر دیا۔ میں نے قرآن کریم کی جتنی تفاسیر پڑھی ہیں، ان میں ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تفاسیر سے بہتر کوئی تفسیر نہیں۔ "ترجمان القرآن" کا مصنف قابل مبارک باد ہے کہ اس نے یورپی سامراج کے زمانے میں بڑی ہمت اور دلیری سے ابن تیمیہ اور ابن قیم کی اس صورت سے پیروی کی ہے، جس طرح انہوں نے منگولی فاتحوں کی مزاحمت کے سلسلے میں کی تھی۔[۸]

مفسر قرآن مولانا احمد سعید دہلوی ترجمان القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "قرآن کریم کی عربی مبین مولانا آزاد کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ آکر اسے اردوئے مبین کے قالب میں ڈھالیں۔ ترجمان القرآن مولانا آزاد کا غیر فانی کارنامہ ہے"۔[۹]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کہتے ہیں: "(سید رشید رضا مصری کی) تفسیر المنار اور مولانا کا ترجمان القرآن مطالب و معانی کے اعتبار سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ زبانیں دو ہیں، مقصد ایک۔ مولانا، علامہ ابن تیمیہ، جاحظ اور ابن قیم کے شانہ بشانہ ہیں"۔[۱۰]

مولانا خود رقمطراز ہیں:

دنیا کی تمام زبانوں میں قرآن کے ترجمے مرتب کیے جائیں اور بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی اشاعت کا سر و سامان ہو، کم از کم مغرب و مشرق کی ان زبانوں میں جو موجودہ اقوام ارضی کی اہم زبانیں تسلیم کی جاتی ہیں۔[۱۱]

زبان و بیان کی سلاست و روانی:

مولانا نے ترجمے میں عام قاری کے ذہن کو ملحوظ نظر رکھا ہے، اور مطالب قرآنی بالکل سادہ مگر اعلیٰ زبان میں پیش کر دیے ہیں تاکہ قاری کو عبارت سمجھنے میں کسی طرح کی پریشانی کا سامنا نہ ہو۔ ترجمان میں مولانا نے الہلال اور البلاغ کی سی ثقیل زبان استعمال نہیں کی، نہ ہی اپنی عادت کے مطابق عربی و فارسی کی ثقیل عبارات اور استعارات استعمال کیے ہیں۔ خود مولانا کہتے ہیں: "ہم نے یہ مطلب اسی سادہ طریقہ پر بیان کر دیا ہے جو قرآن کے بیان و مطالب کا طریقہ ہے"۔[۱۲]

---

[۸] مولانا اخلاق حسین قاسمی، ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ، آزاد اکیڈمی، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی، ۱۹۹۳، ص: ۶۱

[۹] غلام رسول مہر، نقش آزاد، کتاب منزل، لاہور، دوسرا اڈیشن ۱۹۵۹، ص: ۷۸

[۱۰] شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد، ص: ۳۳۴

[۱۱] ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۱۹۸۹، جلد: ۱، ص: ۱۳-۱۴

[۱۲] ترجمان القرآن، جلد: ۲، ص: ۴۳

کسی بھی کلام میں غیر معمولی طور پر استعارات و تشبیہات استعمال کی جائیں، تو اس کی تفہیم میں ذہنی الجھن کا پیدا ہونا فطری ہے، اس لیے مولانا نے ترجمہ و تفسیر میں نہایت سلیس اور سادہ زبان استعمال کرنے کو اولیت دی ہے، جس سے زبان و بیان پر مولانا کی غیر معمولی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

داعیانہ طرز و اسلوب:

مولانا کی تفسیر داعیانہ طرز و اسلوب کو سموئے ہوئی ہے۔ پوری تفسیر کا اسلوب ایسا ہے کہ قاری کا جذبۂ عمل بیدار ہو اور اس کے لئے قرآن پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ مولانا نے قرآن کی دعوت کو جس انداز، اسلوب اور پیرائے میں پیش کیا ہے، وہ بلاشبہ اس زمانے کی روحانی بیماریوں کا علاج تھا۔ مولانا اس وقت دعوت قرآن لے کر نکلے جب مسلمانوں کا انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا اور وہ ہندوستان میں سیاسی زوال اور مذہبی افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ مولانا کا اس زمانے میں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے مخاطب ہونا، پھر 'ترجمان القرآن' کے ذریعے ہم کلام ہونا ایک معجزاتی اسلوب تھا، جو صرف قرآن ہی کی زبان سے بیان ہو سکتا تھا۔

مولانا نے تفسیر و ترجمہ میں قرآن کی حقیقی دعوت اور اس کی شکل و نوعیت سے وہ تمام پردے اٹھائے، جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی مؤثرات نے اس کے چہرے پر ڈال دیئے تھے۔ مولانا نے دین کے مسئلے میں کسی مکتب فکر کے فہم و عمل کی پیروی نہیں کی، بلکہ دین کی دعوت و تعلیم کا صحیح صحیح ابلاغ و اتباع کیا۔

فکری اعتدال پسندی:

ترجمان القرآن مولانا کی فکر وسطیت کا ترجمان ہے۔ تفسیر نگاری میں انہوں نے عقل و نقل دونوں سے یکساں طور پر رہنمائی حاصل کی ہے۔ ان کے لیے رہنما شاہ ولی اللہ دہلوی کا منہج فکر تھا۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی لکھتے ہیں: ''مولانا آزاد کے سامنے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا طرز فکر واضح تھا، جس میں درایت و روایت اور تعقل اور اتباع سلف دونوں باتیں اعتدال کے ساتھ موجود تھیں''۔[۱۳]

تفسیری اجتہاد میں مولانا کا رویہ:

مولانا آزاد نے تفسیری اجتہاد میں اسلاف کے منہج کی مجتہدانہ پیروی کی ہے اور اس کو رہنما بنا کر اپنے زمانے کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی لکھتے ہیں:

مولانا آزاد نے دینی افکار کی تشریح محدثین سلف کے طریقہ کے مطابق کر کے اسلام کے بنیادی افکار وحی و نبوت اور نبوت کے حقائق اور وحدت دین کی تشریح ولی اللہی فکر کے مطابق، حضرات صحابہ کے دینی مقام

---

[۱۳] مولانا اخلاق حسین قاسمی، ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ، ص: ۸۲

و مرتبہ اور تفسیر قرآن میں سلف کرام کے اصولی دائرہ کی پابندی وغیرہ، دین کے مباحث پر روشنی ڈالی۔ ترجمان القرآن کے فکری مباحث کی روح اسی منظر میں واضح ہوتی ہے۔[۱۴]

سامراجیوں سے مرعوب مفکرین کا رد:

مولانا نے اپنی تفسیر میں کسی خاص شخص کا نام لیے بغیر استعماریوں سے مرعوبیت کے شکار مفکرین کا عمدہ طریقے سے رد کیا ہے۔ مولانا کا یہ رد خالص علمی اور مثبت انداز کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تفسیر نے جدید ذہن کے اشکالات کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا قاسمی لکھتے ہیں: "مولانا آزاد مناظرانہ انداز گفتگو کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے سنجیدہ اور مثبت انداز میں سید احمد خان کے تصورات کی ترجمان القرآن میں مکمل تردید ملتی ہے"۔[۱۵]

اختصار و جامعیت:

تفسیر میں جس طرح ایجاز مخل ہے، وہیں اطناب بھی ممل ہے۔اس لحاظ سے مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر اختصار و جامعیت کی حامل ہے، بسا اوقات ایک حاشیہ پورے مقالے کا قائم مقام ہے۔ مولانا خود اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اکثر مقامات میں ایسا ہوا کہ معارف و مباحث کا ایک پورا دفتر دماغ میں پھیل رہا تھا، مگر نوک قلم پر آیا تو ایک سطر یا ایک جملہ بن گیا"۔[۱۶]

"ترجمان القرآن" کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مکمل احتیاط کے ساتھ ایک ایسا طریق بیان اختیار کیا گیا ہے کہ الفاظ کم سے کم اور مطالب زیادہ سے زیادہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز کم ہے تو مطالب کا پھیلاؤ ہے، نفس مطالب میں کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر لفظ اور ہر جملے پر جس قدر غور کیا جائے مطالب و مباحث کے نئے دفتر کھلتے چلے جاتے ہیں اور فکر و نظر کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

جرأت مندانہ تنقید:

ترجمان القرآن کا ایک بڑا حسن نقد و نظر کی جرأت ہے۔ مولانا نے جس سے اختلاف کیا، اس کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے، نہ قدماء سے اختلاف کو گناہ گردانتے اور نہ کسی جماعت یا گروہ سے خائف ہوتے۔ عامۃ المسلمین قدماء کی تقلید کو اصل دین سمجھتے ہیں اور ان پر تنقید کو جرم و گناہ خیال کرتے ہیں۔ مولانا نے امام فخر الدین

---

[۱۴] ماخذ سابق، ص:۹۲

[۱۵] ماخذ سابق، ص:۴۴

[۱۶] ترجمان القرآن، جلد:۱، ص:۵۰

رازی کی معرکۃ الآراء تفسیر ''تفسیر کبیر'' سے متعلق بلا جھجک لکھا ہے: ''اس میں منطق، فلسفہ، حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے، مگر قرآن نہیں ہے''۔[۱۷]

ویسے تو مولانا کی تمام کتابوں سے بعد کے مصنفین نے بھرپور استفادہ کیا ہے، تاہم مولانا کی تفسیر پر بعض حضرات نے متعدد پہلوؤں سے اعتراضات بھی کیے ہیں، جن کے مختلف علمی و فکری پس منظر ہیں۔ معروف مفسر قرآن مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اپنی تصنیف ''ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ'' میں ان اعتراضات کا بالتفصیل جواب دیا ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد اکیڈمی، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

حاصل کلام:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم سے قرآن حکیم کی اس تفسیر کے حوالے سے اتنا ظاہر کر دینا کافی ہے کہ قرآن حکیم کے حقائق و معارف اور اس کی محیط الکل معلمانہ دعوت کا موجودہ دور، جس قلم کے فیضان سے پیدا ہوا ہے، یہ اسی قلم سے نکلی ہوئی مفصل اور مکمل تفسیر القرآن ہے، جس کا مطالعہ نہ صرف علم و معرفت عطا کرتا ہے، بلکہ کلام الٰہی کی تفہیم سے بہرہ ور بھی کرتا ہے۔ قرآن کریم کی جتنی بھی تفاسیر مولانا آزاد کے بعد لکھی گئیں، ان سبھوں میں مولانا کی چھاپ ضرور نظر آتی ہے، البتہ مولانا نے جس وسعت فکر و نظر سے کلام الٰہی کی تفہیم و تعبیر کو اپنے خاص اسلوب و انداز سے بیان کیا ہے، وہ خود اس کے موجد ہیں اور خاتم بھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر سے شغف رکھنے والا ہر ذی علم شخص مولانا کی تفسیر سے ضرور استفادہ کرتا ہے۔

---

[۱۷] شورش کاشمیری، ابوالکلام آزاد: ص: ۳۳۳

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے
ایک نادر نسخۂ بخاری کا تعارف

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن

عظیم آباد، پٹنہ (بہار)
Mob: 9708011534

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ دنیا کے معروف اور اہم علمی ذخیروں میں شمار ہوتی ہے کیوں کہ یہاں مطبوعات کے علاوہ قلمی کتابوں کا شاندار ذخیرہ محفوظ ہے۔بعض مخطوطات نادر ونایاب ہیں جن کے دوسرے نسخے دنیا کے دوسرے کتب خانوں میں بہت کم ملتے ہیں۔بعض قلمی نسخے ایسے بھی ہیں جن کے دوسرے نسخے کہیں نہیں ملتے۔ انہیں نادر ونایاب قلمی نسخوں میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م۱۷۶۲ء) کا وہ نسخہ بخاری شریف بھی ہے جو ان کے دوران درس پیش نظر رہا۔انہوں نے اپنے شاگرد رشید شیخ محمد بن شیخ پیر محمد الہ آبادی کو بخاری پڑھانے کی اجازت دی ان کا ایک اجازت نامہ ہمارے سامنے ہے جو خود شاہ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔یہ بات اس کے ترقیمے سے واضح ہوتی ہے۔جو یہ ہے:

> وکتب بیدہ الفقیرالی رحمۃ اللہ الکریم الودود ولی اللہ احمدبن عبدالرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصوربن محمدعفی اللہ عنہ وعنہم والحقہ وایاہم باسلافہم الصالحین العمری نسبا الدہلوی وطناً الاشرف عقیدۃ الصوفی..... طریقۃ الحنفی عملا والحنفی الشافعی تدریساً خادم التفسیروالحدیث والفقہ والعربیۃ والکلام ولہ فی کل ذلک تصانیف۔ والحمد للہ اولاً وآخراً ، ظاہراً وباطناً ذی الجلال والاکرام، کان ذلک یوم الثلاث الثالث والعشرین من الشوال ۱۱۵۹ھ۔

اس ترقیمہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجازت نامہ خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے تاہم ایک اور تحریر ہے جو حضرت شاہ صاحب کے صاحب زادہ حضرت شاہ رفیع الدین کی ہے۔اس میں بھی انہوں نے تصدیق کی ہے کہ یہ تحریر بلاشبہ حضرت شاہ صاحب ہی کی ہے۔شاہ رفیع الدین کی تحریر یہ ہے:

> ایں خط حضرت والد بزرگوار است بے شبہہ۔کتب الفقیر محمد رفیع الدین

اس لحاظ سے یہ نسخہ نہایت اہم اور قیمتی ہے جس کا تعارف اور علمی و تحقیقی مقام و مرتبہ درج ذیل سطور میں پیش کیا جاتا ہے۔

یہ نسخہ چار جلدوں میں ہے جو بڑے سائز میں ہے اور جس کا ہینڈ لسٹ نمبر ۱۴۴۲ الف ،ب اور ۱۴۴۳،الف،ب اور کیٹلاگ نمبر ۱۳۳ اور ۱۳۴ ہے۔

۱۔ درس دیا ہوا اور تصحیح شدہ نسخہ:

اس کی سب سے اہم اور بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا درس دیا ہوا اور تصحیح شدہ نسخہ ہے جس کی تصحیح کئی بار حضرت شاہ صاحب کی نگرانی میں کی گئی۔ یہ بات شیخ محمد بن شیخ پیر محمد الٰہ آبادی کے ترقیمے والی عبارت سے معلوم ہوتی ہے جو ۶ شعبان المعظم ۱۱۵۹ھ کو دہلی میں لکھی گئی۔ عبارت یہ ہے:

تم الکتاب الجامع للامام الحافظ مقتد الی اہل الحدیث ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل بن ابراهیم بن المغیره البخاری...... فی محروسۃ الدہلی یوم الاربعاء سادس شعبان المعظم فی سنۃ ۱۱۵۹ھ بید احقر العباد شیخ محمد بن شیخ پیرمحمد بن شیخ ابی الفتح العمری البگرامی ثم الٰہ آبادی مع قرأتہ من الاول الی الآخر وتصحیحہ مرۃ بعد اخری فی خدمۃ علماء الزمان...... الشیخ ولی اللہ العمری لازال ظلال نوالہ علینا ظلیلا۔

یعنی امام بخاری کی یہ کتاب دہلی میں ۶ شعبان المعظم ۱۱۵۹ھ کو مکمل ہوگئی جس کو شیخ محمد بن شیخ پیر محمد الٰہ آبادی، عمری، بلگرامی نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اس کو انہوں نے شروع سے اخیر تک پڑھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی نگرانی میں کئی بار اس کی تصحیح کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو ہم پر باقی رکھے۔

۲۔ شاہ عالم بادشاہ کا حکم اعراب:

اس نسخے کی دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ جب شاہ عالم بادشاہ (۱۱۷۳-۱۲۲۱ھ) کو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا درس دیا ہوا ہے اور ان ہی کی نگرانی میں اس کی کئی بار تصحیح ہوئی ہے تو اس نے اس پر اعراب لگانے کا حکم دیا تاکہ حضرت شاہ صاحب کی یہ خدمت زیادہ مستحکم اور پائیدار ہو سکے اور مستقبل کے علمائے حدیث اس نسخے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ یہ تاریخی بات چوتھی جلد کے آخری ورق ۳۴۵ الف کے حاشیہ والی عبارت سے واضح ہوتی ہے جو یہ ہے:

بحمداللہ سبحانہ تصحیح و اعراب صحیح بخاری بحکم اقدس حضرت شاہ عالم بادشاہ خلداللہ ملکہ وسلطانہ وافاض علی العالمین برہ واحسانہ درسنہ یک ہزار ویک صدوہشتاد و چہارہجری ۔فقیرمحمدناصح عفی اللہ ازاول تاآخراز شیخ صححہ باتمام رسید۔

اس تحریر کے کاتب شیخ محمد ناصح ہیں جنہوں نے وضاحت کی ہے کہ اعراب و تصحیح کا کام شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے ۲۲، ربیع الاول ۱۱۸۴ھ کو انجام دیا گیا۔

۳۔ تحقیقات احادیث بخاری:

اس نسخے کی تیسری بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں احادیث و متعلقات احادیث کے سلسلے میں دو سو سے زائد تحقیقات

ہیں۔ یہ زیادہ تر اکابر علمائے حدیث کی ہیں لیکن خود حضرت شاہ صاحب کی تحقیقات بھی کم نہیں ہیں۔ ان کی تحقیقات کی تعداد چھہتر ہے جو احادیث، رجال اور اعراب سے متعلق ہیں۔ اور حواشی میں مختصر اور طویل ہیں۔ یہ زیادہ تر عربی زبان میں ہیں۔ کچھ فارسی میں ہیں۔ یہ تمام حواشی حضرت شاہ صاحب کے شاگرد رشید شیخ محمد بن شیخ پیر محمد الٰہ آبادی کے قلم سے ہیں۔ ان تمام حواشی کے آخر میں حضرت شاہ صاحب کا نام بڑے ادب و احترام کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مثلاً کہیں "من فوائد الشیخ المحدث ولی اللہ سلمہ اللہ تعالیٰ" تحریر کیا ہے، کہیں "شیخ المحدثین سلمہ اللہ" لکھا گیا ہے تو کہیں "شیخ المحدث سلمہ اللہ" کی عبارت ملتی ہے۔ یہ حواشی چاروں جلدوں میں ملے ہیں۔ یہ تمام حواشی علمی و تحقیقاتی لحاظ سے نہایت اہم اور گراں قدر ہیں جن سے حضرت شاہ صاحب کے تبحر علمی کا اظہار ہوتا ہے اور فن حدیث میں ان کے اعلیٰ تنقیدی مشورہ اور بصیرت کا ثبوت ملتا ہے[1]۔

۴۔ اجازت نامۂ حدیث:

شروع میں جیسا کہ حضرت شاہ صاحب کی ترقیع والی عبارت نقل کی گئی ہے۔ اس سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ یہ اجازت نامہ خود حضرت شاہ صاحب کا مکتوبہ ہے۔ جیسا کہ اس کی تصدیق خود ان کے صاحب زادے شاہ رفیع الدین نے کر دی ہے۔ دوسری یہ کہ یہ اجازت نامہ ۲۳ شوال ۱۱۵۹ھ کو لکھا گیا۔ تیسری بات یہ کہ حضرت شاہ صاحب عقیدہ کے لحاظ سے اشعری، طریقے کے لحاظ سے صوفی، عمل کے اعتبار سے حنفی اور تدریسی اعتبار سے حنفی اور شافعی تھے۔ یہ اجازت نامہ اس نسخے کے جلد چہارم کے ورق نمبر ۳۷۵ب سے شروع ہو کر ورق نمبر ۳۷۹الف پر ختم ہوتا ہے۔ یہ چار بڑے سائز کے صفحات پر مشتمل ہے۔

خوبیاں:

اس اجازت نامہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ۶۴ مقامات پر حواشی ہیں۔ جن میں ہرات، دمیاط، کرد وغیرہ جیسے تاریخی مقامات اور محدثین عظام مثلاً امام ترمذی، امام ابوداؤد اور امام دارمی وغیرہ کے بارے میں تاریخی معلومات بھی موجود ہیں۔

امکان ہے کہ یہ عبارتیں بخط شاہ صاحب ہوں۔ کیونکہ ان کا رسم الخط اجازت نامہ کی تحریر کی طرح ہے۔ بعض عبارتیں البتہ حضرت شاہ صاحب کے کسی شاگرد کی لکھی ہیں۔ اجازت نامے میں جابجا بین

---

[1] ان تمام کو راقم سطور نے کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے جو شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت مظفر نگر سے ۲۰۰۷ء میں اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی تحقیقات حدیث کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ تفصیلی مطالعہ کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

السطور کی عبارتیں بھی اہم ہیں۔ مثلاً شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم الکردی کے لیے بین میں ہے کہ "المنسوبۃ الی کردستان، وھی بلادبین الفارس والروم"۔

اس اجازت نامہ میں بخاری شریف کے کچھ اجزا یعنی کتاب المواقیت اور کتاب الھبہ کے کچھ حصوں کو چھوڑ کر مکمل بخاری شریف، صحاح ستہ، مسند دارمی، مشکوۃ المصابیح اور مؤطا امام مالک کا اپنے شاگرد رشید شیخ محمد بن شیخ پیر محمد الٰہ آبادی کو درس دینے کے بعد ان کو پڑھانے کی اجازت ہے۔

ایک اور خوبی یہ ہے کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے جن اساتذہ کرام سے احادیث نبویہ کی تعلیم حاصل کی ان تمام اساتذہ کرام کے نام اس اجازت نامہ میں لکھے گئے ہیں اور ان کے سلسلے کو امام بخاری تک پہنچایا گیا ہے جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے جو سلسلہ حدیث ہندوستان میں شروع کیا ہے وہ امام بخاری پر منتہی ہوتا ہے۔ تدریسی اعتبار سے خدمات حدیث کا آغاز شاہ صاحب کے دور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ آج ہندوستان کے دینی مراکز و مدارس میں حدیث نبوی کے درس وتدریس کی جو رونق ہے وہ شاہ صاحب کی برکات سے ہے۔

راقم سطور نے حضرت شاہ صاحب کی انہیں خدمات کی وجہ سے اس اجازت نامے کو اس کے حواشی کے ساتھ کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے جو عنقریب مرکز تحقیقات شاہ ولی اللہ پٹنہ کی جانب سے شائع ہو گی۔

مولانا محمد یوسف اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ
کی علمی و دینی خدمت کا امتیازی پہلو

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

پروفیسر (ر) اسلامیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

zafarul.islam@gmail.com

''معارف'' (جنوری ۲۰۲۲ء) کے اداریہ کے آخر میں متعدد وفات پانے والوں کے ذکرِ خیر و تعزیتی کلمات کے ضمن میں مادرِ علمی مدرستہ الاصلاح کے مایۂ ناز فرزند، نامور عالمِ دین اور قرآن و حدیث کے ممتاز شارح و ترجمان مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ (۹ جولائی ۱۹۳۲ء۔ ۲۰ دسمبر ۲۰۲۱ء) پر بھی ایک مختصر نوٹ نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ کہ مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ کا سانحۂ ارتحال نہ صرف ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ، بلکہ پورے عالمِ اسلام کے لئے ایک عظیم خسارہ ہے۔ ان کی زندگی کی مصروفیات اس کی شاہد ہیں کہ تحریر و تقریر میں قرآن و حدیث کی آسان و دل نشین تشریح و ترجمانی ان کی علمی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔ قرآن و حدیث کے حوالے سے اصلاحِ معاشرہ کی راہ میں سرگرم رہنا مولانا مرحوم کی دینی خدمات کا سب سے اہم پہلو تھا۔ اسی کو انہوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا اور اس مشن کو آگے بڑھانے میں انہوں نے اپنی تقریری و تحریری صلاحیتوں کو بخوبی استعمال کیا۔ مولانائے گرامی خاص طور سے اپنی تحریری صلاحیتوں کے ذریعہ دین کی جو وقیع خدمت تا حیات انجام دیتے رہے اسے ''معارف'' کے فاضل اداریہ نگار نے بس اِس مختصر سے جملہ میں سمیٹ دیا ہے: ''اسلام کے لئے اپنے قلم کو وقف کرنے میں ساری زندگی گزار دی''۔

مولانا مرحوم کی تعلیمی زندگی کی نشو و نما اور ترقی میں اسلامیہ انٹر کالج بریلی، مظاہر العلوم سہارنپور اور مدرستہ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) کا خاص حصہ رہا ہے۔ مؤخر الذکر تعلیمی ادارے میں وہ شیدائیِ قرآن مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ ان میں قرآن کا ذوق پیدا کرنے اور اس کے گہرے مطالعے کا شوق پروان چڑھانے میں ان کے استادِ محترم کا خصوصی فیض رہا ہے۔ اپنی معروف و مقبول کتاب ''قرآنی تعلیمات'' کے شروع میں مولانا مرحوم نے والدین مکرمین کے لیے یہ دعاء کرتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمتِ قرآن کا اجر و ثواب انہیں عطا فرمائے، اپنے استادِ گرامی کے لئے ان الفاظ میں دعاء مانگی ہے: ''اور میرے شفیق و مہربان استاد حضرت مولانا اختر احسن اصلاحیؒ کو بھی اس کا ثواب پہنچائے جن کی

خاص توجہ اور فیضِ تربیت سے مجھے اس پیش کش کی توفیق نصیب ہوئی"[1]۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ قرآن کریم کی محققانہ تعلیم اور اسی نہج پر طلبہ کی تربیت کا اہتمام مدرسۃ الاصلاح کی بنیادی خصوصیات میں سے ہے۔ مدرسے کے وہ فضلاء بڑے قابلِ قدر اور لائقِ امتثال ہیں جو فراغت کے بعد اس ادارے کی تعلیم و تربیت کے اثرات اپنی علمی و عملی زندگی میں باقی رکھتے ہیں۔ مولانا مرحوم بلاشبہ ایسے فضلاء میں امتیازی مقام کے حامل تھے۔ حفظِ قرآن کے ساتھ خوش الحانی سے متصف ہونا، تلاوتِ قرآن سے خاص شغف رکھنا، قرآن میں مسلسل تدبر و تفکر کرتے رہنا، درسِ قرآن کو محبوب مشغلہ بنا لینا، تقریر و تحریر میں قرآنی افکار و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی پر خاص زور دینا عظیم ترین کتابِ ہدایت سے ان کی گہری دلچسپی کے معروف مظاہر تھے۔ "قرآنی تعلیمات" کا پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۶۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ محض ۳۴۔۳۵ برس کی عمر میں اِس اہم قرآنی کتاب کی تصنیف سے بلاشبہ نوجوانی ہی کی عمر سے مصنفِ محترم کے قرآن سے گہرے تعلق اور اس کتاب ہدایت پر مسلسل تدبر و تفکر کرتے رہنے کا ایک واضح ثبوت ملتا ہے۔ مرحوم کی دوسری انتہائی مقبول و کثیر الاشاعت کتاب "آدابِ زندگی" پہلی بار اپریل ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اولین ماخذ قرآن کریم ہے۔ اس کے بہت سے ابواب کی ابتداء ہی موضوع کی مناسبت سے آیت/آیات کی تشریح و ترجمانی سے کی گئی ہے اور متعدد مقامات پر درمیان میں بھی زیرِ بحث موضوع سے متعلق آیاتِ کریمہ نقل کرنے کے بعد ان کی تشریح و ترجمانی پیش کی گئی ہے۔ خود مصنفِ گرامی نے کتاب کے ماخذ کے بارے میں یہ واضح کیا ہے: "کتاب اللہ، اسوۂ رسول ﷺ اور اسلاف کے زندۂ جاوید آثار کی رہ نمائی اور اسلامی ذوق و مزاج کی روشنی میں زندگی کا سلیقہ سکھانے والا یہ مجموعہ [آدابِ زندگی] مرتب کیا گیا ہے"[2]۔

انسان کی روز مرہ زندگی کے مسائل و معاملات پر اسلامی تعلیمات کی وضاحت میں ان کی چھوٹی بڑی ۵۰ سے زائد کتابیں اور سیکڑوں مضامین ملتے ہیں۔ قرآن و حدیث اور سیرتِ نبوی ﷺ پر ان کی متعدد کتب میں عمومی انداز میں حیاتِ انسانی کے مختلف اہم شعبوں (عبادات، سماجی تعلقات، معاشی معاملات اور اخلاقیات) سے متعلق اسلامی تعلیمات و احکام واضح کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفِ گرامی مرحوم نے اپنی کچھ کتابوں میں خاص طور سے خاندانی نظام کی بہتری، معاشرتی اصلاح اور روز مرّہ زندگی کے اسلامی طور وطریق کے بارے میں قرآن و سنت کے حوالے سے بحث کرنے پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ اس پہلو سے ان

---

[1] قرآنی تعلیمات، مکتبۂ ذکریٰ، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳

[2] آدابِ زندگی، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، اپریل ۱۹۶۸ء، [تعارف] ص ۹

کی یہ کتب قابلِ ذکر ہیں: خاندانی استحکام، اسلامی معاشرہ، خطبۂ نکاح، عزت کی زندگی اور مسلمانانِ ہند، برائیوں کے طوفان میں آپ کیا کریں؟، حسنِ معاشرت اور اس کی تکمیل میں خواتین کا حصہ، اسلامی معاشرہ اور اس کی تعمیر میں خواتین کا حصہ، مسائل اور ان کا حل۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ دور میں جنم پانے والی اور بڑھتی ہوئی معاشرتی خرابیوں کے سیاق میں ان کتابوں کی معنویت اور قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی بعض کتابوں (صحیح تصورِ دین، دین کیا ہے؟، شعورِ حیات) میں حیاتِ انسانی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر اور دین کے صحیح تصور کی وضاحت کی ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے سے اس نکتے پر خاص زور دیا ہے کہ اسلام میں حیات انسانی کے مختلف شعبوں میں اعتدال مطلوب ہے اور یہ کہ دینِ فطرت مادّی و روحانی یا دنیوی و دینی امور میں توازن برقرار رکھنے کا داعی ہے۔ مولانا مرحوم کی یہ تحریریں بھی لوگوں کی روزمرہ زندگی میں سُدھار لانے کے اعتبار سے بڑی مؤثر و مفید ہیں۔ دنیا کی زندگی کے بارے میں اسلام کا واضح نقطۂ نظر کیا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں دین کا صحیح تصور کیا ہے؟ اگر کسی شخص کے سامنے یہ نکات اچھی طرح واضح ہو جائیں، دین کا صحیح شعور بیدار ہو جائے اور اس کی عملی زندگی اس کے اثرات قبول کر لے تو دنیا کے مختلف معاملات میں وہ اعتدال و توازن کی راہ پر گام زن ہو جائے گا۔ اس کے اندر سے بہت سی برائیاں و خرابیاں خود بخود دور ہو جائیں گی اور اس کا خوش گوار نتیجہ یہ سامنے آئے گا کہ ایسا شخص راہِ مستقیم پر چل پڑے گا اور اس کے مذہبی، سماجی و معاشی معاملات صحیح نہج پر انجام پاتے رہیں گے۔

مضمون یا مواد کے اعتبار سے مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ کی تصانیف کی اہمیت و افادیت کے علاوہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان کے اپنے امتیازات ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں آسان زبان، سہل اسلوب اور عام فہم اندازِ بیان ہے۔ سچ یہ کہ انہیں مولانا مرحوم کی تحریروں کا خاصّہ کہا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ان کے اصلاحی مشن کی ایک مؤثر حکمتِ عملی تھی۔ ان کی متعدد کتب (بالخصوص قرآنی تعلیمات، آدابِ زندگی، گلدستۂ حدیث، داعیِ اعظم ﷺ، فقہِ اسلامی، مختصر احکامِ حج، روشن ستارے، حسنِ معاشرت اور اس کی تکمیل میں خواتین کا حصہ) کے نہ صرف درجنوں ایڈیشن منظرِ عام پر آئے ہیں، بلکہ ان میں سے کچھ کتب کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حقیقت یہ کہ ایک وسیع حلقے میں ان کی نگارشات کی پسندیدگی اور مقبولیت میں مذکورہ بالا تصنیفی خصوصیات کا بہت اہم رول رہا ہے۔ مولانا مرحوم کی معروف تصنیف ''قرآنی تعلیمات'' کے پیش لفظ (مرقومہ: ۲۷ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ،۱۸ اپریل ۱۹۶۶ء) میں ممتاز عالمِ دین و ماہر علومِ قرآنی مولانا صدر الدین اصلاحیؒ (م: ۱۳ نومبر ۱۹۹۸ء) نے اُن اہلِ قلم کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے جو قرآنی افکار و تعلیمات کی تشریح و ترجمانی کے لئے آسان زبان و سادہ اسلوب اختیار کرتے ہیں تاکہ ہر سطح کے لوگ ان سے استفادہ کر سکیں، زیرِ تعارف کتاب کی اسی خصوصیت کو ان الفاظ میں اجاگر کیا ہے: ''یہ

کتاب ''قرآنی تعلیمات'' بھی جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی مبارک سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں قرآن کریم کی ہدایات اور تعلیمات کو الگ الگ عنوانوں کے تحت مرتب کیا گیا ہے، اور اندازِ بیان نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم رکھا گیا ہے تاکہ عام ذہن کا آدمی بھی بات سمجھ لینے میں دِقّت نہ محسوس کرے''[3]۔ واقعہ یہ کہ مولانا مرحوم کی تقریروں و تحریروں سے یہ پیغام بہت ہی واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ جو مقرر، مضمون نگار یا مصنف یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تقریر یا تحریر (بالخصوص قرآن و حدیث کی تشریح و ترجمانی) کے مطالب تک زیادہ سے زیادہ لوگوں کی رسائی یا ان کی کتابوں کے مشتملات سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے علاوہ عام پڑھے لکھے لوگ بھی اچھی طرح فائدہ اٹھائیں تو انہیں چاہئے کہ وہ آسان زبان و سادہ اسلوب اختیار کریں۔ (جلد ہی ''معارف'' کے آخری صفحہ پر ''مضمون نگاروں کے لئے اعلان'' میں یہ یاددہانی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ''آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں'')۔

مزید براں مولانا کی علمی خدمات میں ماہنامہ ''ذکریٰ'' کی ۱۹۷۲ء سے پابندی سے اشاعت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ رسالہ بھی دراصل مولانا کے اصلاحی مشن کا ایک اہم حصہ تھا۔ عام پڑھے لکھے لوگوں (بالخصوص نونہالوں و نوجوانوں) کی صحیح نہج پر ذہن سازی میں اس رسالے کے مشتملات معاون بنتے ہیں۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کے لئے اپنی قلمی کاوشیں پیش کرتے وقت مولانا مرحوم کے پیشِ نظر عام پڑھے لکھے مسلمان رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی علمی یادگاروں کے مشتملات یا مضامین پر نظر ڈالنے سے ایک لائقِ توجہ بات یہ بھی سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنی بعض کتابوں میں خاندانی و معاشرتی زندگی کی تعمیر و اصلاح میں خاص طور سے خواتین کے کردار سے بحث کی ہے۔ مزید براں ان کی بہت سی کتابوں کے خصوصی مخاطب ملت کے نونہال و نوجوان بنے ہیں۔ اس ضمن میں اہم بات یہ کہ مولانا مرحوم نے کئی کتابوں کا انتساب ملت کے نونہالوں و نوجوانوں کے نام ناصحانہ انداز، دل نشیں اسلوب و لطیف زبان میں ان کے لئے دعائیہ کلمات کے ساتھ کیا ہے۔ نوجوانوں کو دینی باتوں کی طرف راغب کرنے یا انہیں نصیحت آمیز کتابوں کو پڑھنے کا شوق دلانے کے لئے مولانا مرحوم کیا کیا سبیل اختیار کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک عام فہم کتاب ''روشن ستارے'' (جو علم کی اہمیت، اور دینی علم کی قدر و قیمت، ایمان و اخلاص، عبادت و اطاعت اور حسنِ اخلاق و معاملات سے متعلق قرآن کی تعلیمات، سیرتِ نبوی ﷺ کے روشن شہ پارے، صحابہ کرامؓ اور اسلاف کی زندگی کے عبرت و نصیحت بھرے واقعات کا مجموعہ ہے) کا انتساب ملت کے نونہالوں کے نام ان الفاظ میں

---

3 قرآنی تعلیمات، محولہ بالا، ص ۷۔۲ (پیش لفظ)

کیا ہے: ''ملت کے نونہالوں کے نام، اس دعاء کے ساتھ کہ خدا ان کو اپنے اسلاف کا سچا جانشیں بنائے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق و سعادت عطا فرمائے۔ آمین ''[4] اسی طرح سیرتِ نبوی ﷺ پر اپنی عام فہم مختصر کتاب ''داعیِ اعظم ﷺ'' کے پیش لفظ کے آخر میں اسے شرفِ قبولیت بخشنے کی دعاء میں مصنفِ محترم نے خاص طور سے ملت کے ''شاہین بچوں'' کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے: ''خدا سے دعا ہے کہ وہ اس مختصر تالیف کو زیادہ سے زیادہ شرفِ قبولیت بخشے، خاص طور پر ملت کے شاہین بچّے اس سے بیش از بیش فائدہ اٹھائیں''[5]۔

مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ نے بلاشبہ امت کے ہر طبقے کے افراد میں دینی شعور بیدار کرنے، دینِ حق سے ان کا تعلق مضبوط کرنے اور زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق اسلامی اصول وآداب واضح کر کے انہیں اِن کے مطابق اپنی زندگیوں کو سنوارنے کی طرف متوجہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی بہت سی کتابوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے تربیتی واصلاحی لٹریچر کا خاص ہدف یا متعدد کتب کا خصوصی مخاطب ملت کے نوعمر بچوں، نونہالوں اور نوجوانوں کو بنایا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کتابوں و مضامین میں مولانا مرحوم نے ان کی ذہنی سطح، علمی پہنچ، زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی پسند اور ان کے ذوق وشوق اور مزاج کو ملحوظ رکھا ہے۔ وہ بخوبی یہ سمجھتے تھے کہ بچّوں و نوجوانوں کو کیسی تحریریں پسند آتی ہیں، کس قسم کی کتابیں وہ خوب شوق سے پڑھتے ہیں، کس نوع کے واقعات ان کے دل ودماغ کو زیادہ اپیل کرتے ہیں اور ان کے لئے کس طرح زبان استعمال کرنا زیادہ مفید ہوگا؟ حقیقت یہ کہ مولانا مرحوم نہ صرف ان کے ذوق و شوق کے مطابق تحریریں جمع کرتے اور کتابیں مرتب کرتے تھے بلکہ اِن کتابوں کو نونہالوں ونوجوانوں کے لئے بہترین تحفہ قرار دیتے تھے۔ مذکورہ بالا قیمتی وانتہائی مفید کتاب ''روشن ستارے'' کی تالیف کے پس منظر کی وضاحت میں مؤلفِ گرامی تحریر کرتے ہیں: ''کئی سال پہلے (غالباً ۱۹۶۲ء میں) دورانِ مطالعہ جب اس طرح کے [سبق آموز و بصیرت افروز] کچھ واقعات اور کارنامے سامنے آئے تو بے اختیار جی چاہا کہ ان کو عام فہم زبان میں مؤثر ترتیب کے ساتھ جمع کیا جائے۔ اپنے اسلاف اور ان کے بصیرت افروز کارناموں سے دلچسپی کس کو نہیں ہوتی۔ نوعمر بچّے تو خاص طور پر اس طرح کے واقعات کو بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ پڑھتے اور اثر لیتے ہیں۔ ارادہ کر لیا کہ نونہالوں اور

---

[4] روشن ستارے، ذکریٰ انٹرنیشنل پبلشرز، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۳

[5] داعیِ اعظم ﷺ، مکتبۂ ذکریٰ، رام پور، ۱۹۸۳ء، ص ۵

نوجوانوں کو یہ تحفہ ضرور پیش کیا جائے اور ترتیب کا کام شروع کر دیا"[6]۔ اسی کے ساتھ مولانا مرحوم کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ معاشرے کی موجودہ صورتِ حال میں جب کہ دین سے غفلت اور دینی باتوں سے بے توجہی بڑھتی جارہی ہے کم عمر بچوں یا نو عمر افراد کے لئے تربیتی کتابیں (بالخصوص سبق آموز واقعات پر مشتمل) مرتب کرنے کی ضرورت پہلے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب ہی کے تعارف میں اس قسم کی کتابوں کی ضرورت وافادیت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں: "دین سے غفلت کے اس عبرت ناک دور کی اہم ترین ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایسے واقعات اور کارناموں کی اشاعت ہو جن کو پڑھ کر اور سن کر بچےّ اور نو عمر افراد اسلاف کی زندگیوں کو اپنے لئے نمونہ بنائیں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کے جذبے اور ولولے سے سرشار ہوں"[7]۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نونہال و نوجوانان ملت و قوم کے بڑے قیمتی اثاثہ ہیں۔ اگر یہ راہِ مستقیم پر گام زن ہوتے ہوئے اپنی توانائیاں صحیح رخ پر لگا دیں اور اپنی صلاحیتوں کو نیک و مفید کاموں میں استعمال کرنے لگیں تو نہ صرف گھر وخاندان کے حالات بہت کچھ سدھر جائیں گے بلکہ پورے معاشرے پر اس کے اچھے اثرات مترتب ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا مرحوم خاص طور سے نونہالوں و نوجوانوں کی تربیت واصلاح کے لیے بڑے فکر مند و کوشاں رہتے تھے۔ نہ صرف ان کی نگارشات، بلکہ ان کی علمی وسماجی و ملی مصروفیات کے ایک ایک پہلو سے اس کی شہادت ملتی ہے۔

آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مختلف طریقے سے زندگی کے مختلف معاملات میں اسلامی اصول وآداب سے واقف کرانے کے ساتھ مولانا مرحوم اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ لوگ اِن اصول وآداب کو عملی طور پر اپنا کر اپنی زندگی کو سنوار لیں۔ اس پہلو سے ان کی انتہائی مقبول کتاب "آدابِ زندگی" کا فرزندانِ اسلام کے نام انتساب بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اسے ملاحظہ کیجئے: "اُن فرزندانِ اسلام کے نام جو رضائے الٰہی کی خاطر بندگانِ خدا کے دلوں میں اسلام کے لیے جذبۂ شوق وعقیدت پیدا کرنے کی آرزو میں اِن اسلامی آداب سے اپنی زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں"[8]۔ اس کتاب کے تعارف میں بھی مصنفِ محترم نے قارئین کو یہ مشفقانہ پیغام دیا ہے کہ اللہ کی عطا کردہ زندگی سے لطف اندوز ہونے اور اسے کامیاب بنانے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے، لیکن یہ حق صحیح معنوں میں اسی وقت ہے جب ایک شخص نہ صرف کامیاب زندگی کے اصول وآداب سے واقف ہو، بلکہ اپنی زندگی کو عملی طور پر ان سے آراستہ

[6] روشن ستارے، محولہ بالا، ص ۱۷

[7] روشن ستارے، ص ۱۷

[8] آدابِ زندگی، ص ۷

کرنے کی کوشش میں مسلسل سر گرم رہے۔ یہ ناصحانہ پیغام انہی کی شیریں زبان ودل نشیں اسلوب میں نقل کرنا زیادہ مؤثر ثابت ہوگا:

زندگی سے بھر پور فائدہ اٹھانا، خاطر خواہ لطف اندوز ہونا اور فی الواقع کامیاب زندگی گزارنا یقیناً آپ کا حق ہے، لیکن اسی وقت جب آپ زندگی کا سلیقہ جانتے ہوں، کامیاب زندگی کے اصول وآداب سے واقف ہوں اور نہ صرف واقف ہوں، بلکہ عملاً آپ ان اصول وآداب سے اپنی زندگی کو آراستہ و شائستہ بنانے کی کوشش میں پیہم سر گرم بھی رہیں"[9]۔

اللہ ربّ العزت نے مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ کو علمی صلاحیتوں کے ساتھ تنظیمی صلاحیت اور نظم و نسق کے سلیقہ سے بھی نوازا تھا۔ جماعتِ اسلامی ہند کی جانب سے مفوضہ ذمہ داریاں وہ بحسن و خوبی انجام دیتے رہے، جیسا کہ جماعت کے حلقوں میں اس کا عام طور پر اعتراف پایا جاتا ہے۔ رام پور میں دینی تعلیم کے دونوں قدیم و مشہور ادارے (درس گاہِ اسلامی اور جامعۃ الصالحات) میں ان کی انتظامی صلاحیتوں کے فیوض خوب جاری رہے۔

مولانا کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو (جس کا کم ذکر آتا ہے) اعلیٰ ظرفی، توسع اور مختلف مکاتبِ فکر کے لوگوں سے راہ ورسم رکھنا ہے۔ علی گڑھ میں تبلیغی جماعت کے سر گرم کارکن ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے ان کے انتقال کے بعد مجھ سے بیان کیا کہ وہ جب جماعت کے ساتھ رام پور جاتے تھے اور مولانا مرحوم سے ملاقات کے لئے ان کے گھر حاضر ہوتے تو بڑی محبت واپنائیت سے پیش آتے اور خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہ رکھ چھوڑتے اور ان سب سے اہم یہ کہ موجودہ دور میں معاشرے کی بگڑی ہوئی صورتِ حال میں دعوتِ دین کے مسائل پر وہ کھل کر تفصیلی گفتگو کرتے تھے اور بعض معاملات کے حل میں دینی پہلو سے ان سے مشورہ بھی طلب کرتے۔ ہند کی ملتِ اسلامیہ کے موجودہ حالات اور اس کے افراد کو درپیش سنگین مسائل کے پس منظر میں مولانا کا یہ وصفِ محمود بھی بہت کچھ درس دے رہا ہے۔

مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، علی گڑھ ورام پور میں مولانا مرحوم سے بارہا ملاقات کا اور ان کی صحبتوں میں کچھ وقت گزارنے کا شرف نصیب ہوا۔ اُن کے جن اوصاف محمودہ نے اس ناچیز کو خاص طور سے متاثر کیا وہ ان کی سادگی، شرافت، خوش خُلقی و خورد نوازی تھی۔ قرآن کا زبانی درس دینے یا اسے ضبطِ تحریر میں لانے کی تیاری میں علمِ قرآن کا یہ طالب علم ان کی معروف کتاب "قرآنی تعلیمات" سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔ اسی کتاب کے انگریزی ترجمہ (Teachings of the Holy Quran) کا تعارف تحریر کرنے کی

---

[9] آدابِ زندگی [تعارف]، ص۸

سعادت بھی اِس ناچیز کو نصیب ہوئی تھی جو ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کے ترجمان ''ششماہی علوم القرآن'' (۱۸، ۲، جولائی۔ دسمبر ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۰۔۱۴۱) میں شائع ہوا تھا۔ آخر میں اس اعتراف میں خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ قرآن و حدیث کی توضیحات پر مشتمل مرحوم کی کتابوں کے علاوہ ان کی شخصیت میں رچی بسی خوبیوں کا بھی اس ناچیز کی تربیت میں حصہ رہا ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا محمد یوسف اصلاحیؒ قرآن و حدیث کے حوالے سے اصلاحِ معاشرہ کی راہ کے مردِ مجاہد تھے۔ اس راہ میں پوری زندگی رواں دواں رہنا ان کی شخصیت کا سب سے روشن اور نہایت قابلِ قدر پہلو ہے۔ مولانا مرحوم کی شب و روز کی مصروفیات اس کی شاہد ہیں کہ انہوں نے تقریری و تحریری اور دوسری صلاحیتوں کو دین کی خدمت لئے وقف کر دیا تھا۔ ان کی دعوتی و تذکیری مجالس کا سلسلہ اپنے وطن کے علاوہ بیرونی ممالک بالخصوص امریکہ میں بھی جاری رہا جہاں ان کا سفر عام طور پر سال میں ایک بار ہوتا تھا اور وہاں مختلف مقامات پر ان کے درسِ قرآن اور تذکیری خطاب کا اہتمام ہوتا تھا۔ بلا شبہ ان اصحابِ علم کی زندگی موجبِ عبرت و نصیحت اور لائقِ امتثال ہے جو اللہ رب العزت کی عطا کردہ مختلف النوع صلاحیتوں کو نیک و مفید کاموں میں لگا دینے کو ان کا بہترین مصرف سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں۔

اخبار علمیہ

مسلم دنیا کے متعلق ایک چشم کشا رپورٹ کا خلاصہ

دنیا کی پوری انسانی آبادی کا تقریبا۲۲ فیصد حصہ مسلمان ہیں۔یعنی تقریبا ہر پانچواں فرد مسلمان ہے۔ان کی کل آبادی ڈیڑھ ارب سے متجاوز ہے۔کل مسلم ملکوں کی تعداد ۵۷ ہے۔ان میں ایسے بھی ملک ہیں جہاں اسلامی جمہوریہ یا اسلامی نام نہیں ہے۔ محض مسلم اکثریت کی وجہ سے او آئی سی کے رکن ہیں۔ایشیا میں ایک ارب،افریقہ میں ۴۰ کروڑ،یورپ میں ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ اور امریکہ میں آباد مسلمانوں کی تعداد ۶۰ لاکھ کے قریب ہے۔آسٹریلیا میں بھی مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد بود باش رکھتی ہے۔او آئی سی ممالک میں ہر تیس لاکھ افراد کے لیے ایک یونیورسٹی ہے۔پورے ۵۷ ملکوں کے ڈیڑھ ارب لوگوں نے صرف ایک ہزار یونیورسٹی بنائی ہے۔اس کے بالمقابل امریکہ میں چھ ہزار،ہندوستان میں ۹ سو یونیورسٹیاں ہیں۔دنیا کی پانچ سو بہترین یونیورسٹیوں میں ایک عرصہ تک کسی مسلم ملک کی کوئی یونیورسٹی شامل نہیں تھی لیکن اب دنیا کی ۶۰۰ بہترین جامعات میں پانچ جامعات شامل ہو چکی ہیں۔[1] اقوام متحدہ کے پروگرام برائے ترقیات (یو این ڈی پی) کے مطابق عیسائی ممالک میں شرح خواندگی ۹۰ فیصد ہے۔۱۶ عیسائی ممالک میں شرح خواندگی صد فیصد ہے۔[2] جب کہ مسلم ملکوں میں شرح خواندگی اوسطا ۴۰ فیصد ہے اور صد فیصد شرح خواندگی والا کوئی مسلم ملک نہیں ہے۔ مسلم ملکوں میں صرف دستخط کرنے اور اخبار کی شہ سرخی پڑھنے والا خواندہ قرار دیا جاتا ہے۔اس طرح ۴۰ فیصد میں ۹۰ فیصد لوگ تو اسی سطح و شرح کے شامل ہیں ۔اس کے بر خلاف عیسائی ممالک میں ۹۸ فیصد نے پرائمری تعلیم مکمل کی ہے۔ مسلم ملکوں میں صرف ۵۰ فیصد ایسے لوگ ہیں۔ مسلم ملکوں کے دو فیصد اور عیسائی ملکوں کے ۴۰ فیصد طلبہ یونیورسٹی سطح تک پہنچتے ہیں۔ مسلم ملکوں میں دس لاکھ لوگوں میں صرف ایک خوش نصیب سائنس داں بن پاتا ہے۔امریکہ میں دس لاکھ پر ۴۰۰۰ سائنس داں ہیں۔جاپان میں دس لاکھ پر ۵۰۰۰ سائنس داں ہیں۔پورے عرب ملکوں میں متحرک اور فعال سائنس دانوں کی مجموعی تعداد ۳۵۰۰ اور فی دس لاکھ پر تکنیکی ماہرین صرف ۵۰ ہیں۔عیسائی ملکوں میں دس لاکھ پر ایک ہزار تکنیکی ماہرین ہیں۔جاپان،فن لینڈ اور آئس لینڈ وغیرہ میں ہر ملک میں دس لاکھ پر محققین کی شرح ۵ ہزار اور اس کے بالمقابل مسلم ملکوں میں صرف تین محقق ہیں۔ مسلم ملکوں میں اسکولوں،کالجوں اور تکنیکی اداروں کی شدید قلت ہے۔ تعلیم ناقص،مہنگی اور تحقیق کا عنصر بھی ناقابل بیان ہے۔ مسلم ملکوں میں جی ڈی پی کا محض 0.2 فیصد خرچ کیا جاتا ہے اور عیسائی ممالک میں جی ڈی پی کا ۵ فیصد حصہ تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے۔دنیا کی

---

[1] رپورٹ میں ان پانچ جامعات کے نام پتے درج نہیں ہیں۔

[2] رپورٹ میں ان ملکوں کے نام نہیں لکھے گئے ہیں۔

سب سے بڑی لائبریری امریکہ کی لائبریری آف کانگریس ہے جس میں ایک کروڑ تیس لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں اور عالم عرب کی سب سے بڑی لائبریری مدینہ یونیورسٹی کی لائبریری ہے جہاں چالیس لاکھ کتابیں ہیں۔ مسلم دنیا میں ایک ہزار افراد کے لیے ایک روزنامہ ہے۔ برطانیہ میں اوسطاً ہر دس لاکھ کے لیے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد دو ہزار ہے۔ جبکہ مصر جہاں شرح خواندگی اور مسلم ملکوں سے بہتر ہے ہر دس لاکھ پر صرف ۲۰ کتابیں ہیں۔ عالمی سطح کے سائنسی مقالات کی فی دس لاکھ پر ۱۳.۷ ہے۔ مسلم ملکوں کی کوئی بھی ایسی نیوز ایجنسی نہیں ہے جو معتبر ہو۔ الجزیرہ بھی رائیٹرز، ایسوسی ایٹڈ پریس اور اے ایف پی وغیرہ سے خبریں لیتا ہے۔ اعلیٰ ٹکنالوجی برآمدات میں پاکستان کی مجموعی برآمدات کا محض ایک فیصد حصہ اعلیٰ ٹکنالوجی کا ہوتا ہے۔ سعودی عرب کی کل برآمدات میں اعلیٰ ٹکنالوجی والی مصنوعات کا محض 0.3 فیصد حصہ ہوتا ہے۔ ۵۷ ملکوں کے ڈیڑھ ارب لوگ مل کر محض ۲ ٹریلین ڈالر سالانہ کما پاتے ہیں۔ چین اکیلے ۸، جاپان 3.8 اور جرمنی 2.8 ٹریلین سالانہ کماتا ہے۔ متحدہ عرب امارات، کویت، سعودی عرب اور قطر جیسے امیر خلیجی ممالک بھی مجموعی طور پر ۵ سو ارب ڈالر سالانہ کماتے ہیں۔ جب کہ چھوٹا سا ملک اسپین ہر سال ایک ٹریلین ڈالر کماتا ہے۔ کیتھولک پولینڈ ۵ سو اور بدھسٹ ۵۴۵ ارب ڈالر کماتے ہیں۔ ایک سروے کے مطابق مسلم ملکوں کی مجموعی قومی پیداوار گھٹتی جا رہی ہے۔ مسلمان تمام دنیا کا ۲۲ فیصد ہیں لیکن دنیا بھر کی مجموعی قومی پیداوار کا ۹۵ فیصد حصہ غیر مسلم دنیا میں ہوتا ہے۔ ملیشیا، انڈونیشیا اور مراکش تین ایسے ملک ہیں جن کی برآمدات میں اعلیٰ ٹکنالوجی کا حصہ دس فیصد سے زیادہ ہے۔ اگر یہ آئینہ معتبر ہے تو کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔؟ (منصف، حیدرآباد ۸ فروری ۲۲ء صفحہ سائنس و ٹکنالوجی ص ۴)

پاکستان میں فرضی یونیورسٹیاں

ریگولیٹری اداروں اور حکومتی اہلکاروں کے درمیان ہم آہنگی کے فقدان، عدم دلچسپی اور کنفیوژن کے باعث ملک میں ۱۵۰ کے قریب نجی یونیورسٹیاں فرضی یا غیر قانونی طور پر کام کر رہی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن خود کو صرف ایسے جعلی، غیر قانونی اور غیر تسلیم شدہ اداروں کی نشاندہی تک محدود رکھتا ہے جب کہ صوبائی ادارے ان یونیورسٹیوں کے خلاف غیر فعال ہیں۔ ایچ ایس سی کی طرف سے شائع کی گئی ایک تازہ ترین فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ پورے پاکستان میں ۱۴۷ فرضی یونیورسٹیاں کام کر رہی ہیں۔ کمیشن نے طلبہ اور والدین کو خبردار کیا ہے کہ وہ ان نجی سہولیات والی جامعات میں داخلہ کے لیے درخواست دیتے وقت چوکس رہیں۔ صوبہ وار اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب ۹۶ نجی یونیورسٹیوں کے ساتھ رجحان میں سرفہرست ہے جو غیر تسلیم شدہ ہیں لیکن پھر بھی سیکڑوں طلبہ کو کوئی ڈگری پروگرام پیش کر رہی ہیں۔ سندھ میں ۳۵ غیر قانونی یونیورسٹیاں ہیں۔ سب سے زیادہ فرضی یونیورسٹیاں کراچی میں ہیں۔ اس کے بعد خیبر پختونخوا میں ۱۱، آزاد جموں وکشمیر میں تین اور اسلام آباد میں دو بوگس (فرضی) یونیورسٹیاں ہیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن ان جعلی، غیر قانونی اور غیر تسلیم شدہ اداروں کے خلاف کارروائی اس لیے نہیں کرتا کیونکہ یہ اکیلے کمیشن کا کام نہیں ہے۔ ایچ ای سی کے ترجمان نے مشورہ دیا ہے۔

کمیشن کی میڈیا ڈائریکٹر جنرل عائشہ اکرام نے کہا ''ایچ ای سی تمام صوبائی حکومتوں کے ساتھ قریبی رابطہ کاری میں کام کررہاہے۔تاکہ غیر قانونی طور پر کام کرنے والی یونیورسٹیوں اور اداروں کی نشاندہی اور ان کے خلاف سخت کارروائی کی جاسکے''۔اس کے علاوہ ایچ ای سی اپنی ویب سائٹ پر ایڈوائزری بھی لگاتاہے اور وقتاً فوقتاً قومی اور علاقائی روزناموں میں انتباہات شائع کیے جاتے ہیں۔جس میں والدین، طلبہ اور عام لوگوں کو خبر دار کیا جاتا ہے کہ وہ ایسی غیر قانونی یونیورسٹیوں اور اداروں میں داخلہ لینے سے گریز کریں۔کیونکہ ان سے حاصل کردہ سند قابلیت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔(تاثیر،پٹنہ۷،فروری۲۲ء ص۹)

''فکر'' ورڈ آف دی ایئر

آکسفورڈ یونیورسٹی کے لغت نویسوں نے کرونا کے اس دور میں برطانیہ کے تین سے نو سال کے آٹھ ہزار بچوں سے صحت، حال چال اور لاک ڈاؤن جیسے لفظوں کے استعمال پر رائے مانگی تھی۔ان میں ۱۹ فیصد یعنی پانچ میں سے ایک بچہ نے چنتا (فکر) کو سب سے زیادہ ووٹ کیا۔اس طرح یہ لفظ ورڈ آف دی ایئر یعنی سال کا لفظ قرار پایا ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ اس جائزہ کے جو نتائج سامنے آئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کے ذہن پر اس بیماری کا کس قدر اثر پڑا ہے۔اس سے وابستہ جینکنس کہتے ہیں کہ کرونا کے دور میں بچوں کے لیے لفظ ''چنتا'' ایک نمبر کا لفظ ہے حالانکہ اس وبا کے سبب لگی پابندیوں اور ہونے والی تبدیلیوں پر جب توجہ دی جائے گی جس کو بچوں نے خاص طور پر جھیلا ہے تو یہ لفظ بالکل ہی تعجب انگیز نہیں محسوس ہوگا۔گذشتہ برس بچوں میں سب سے زیادہ رائج لفظ ''کروناوائرس'' اور ۲۰۱۹ء میں ''بریکجٹ'' تھا۔اسی طرح ایک اور تجزیہ میں ۱۹ فیصد بچوں نے ''چیلنج'' اور ۱۴ فیصد بچوں نے ''آئی سولیٹ'' کو سب سے زیادہ استعمال ہونے والے لفظوں میں منتخب کیا تھا۔''لاک ڈاؤن'' اور ''ببل'' کے ساتھ ''سیلف آئیسو لیشن'' کے الفاظ بھی اس دور میں رواج پذیر ہوئے۔اویوپی شعبہ السنۂ اطفال عشروں سے بچوں پر ایسی تحقیقات کررہاہے جس میں ماہرین تعلیم ولغت بچوں کی لفظیات اور ان کی آزادانہ نفسیات کا تجزیہ کرتے ہیں۔اسی بنیاد پر یہ شعبہ موجودہ عہد میں اپنے لغات اپڈیٹ (ترمیم واضافہ) کرتا ہے۔تاکہ اسکولوں میں ان لفظوں کا رواج و چلن بڑھ سکے۔اسی کے ساتھ ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ بچوں کی لفظیات اور ان کی لسانی صلاحیت ولیاقت کے تئیں ان کے والدین کی ذمہ داری اور بڑھ گئی ہے۔بچوں کو اسکول کے ساتھ ساتھ اب گھر پر بھی پورا تعاون کرنا پڑے گا۔جس سے وہ نئے لفظوں کو سیکھیں۔انہیں یہ بھی خیال رکھنا ہوگا کہ بچے ان کے آس پاس سیکھ رہے ہیں۔

(ہندوستان، وارانسی ہندی روزنامہ ۲۰/جنوری ۲۲ء ص ۱۲)

آنحضور ﷺ کے سفر ہجرت کی دستاویزی شکل

اسلامی تاریخ کے پروجیکٹ ''رحلت مہاجر'' کے منتظمین نے کہا ہے کہ پیغمبر اسلام کی ہجرت کے سفر کی دستاویزی

شکل دینے کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا ہے۔ عرب نیوز کے مطابق پیغمبر اسلام کی سوانح عمری پر ماہرین اور محققین کے ساتھ مل کر کام کیا گیا ہے۔ جو دراصل مکہ میں جبل ثور کلچرل سینٹر کے افتتاح کے لیے کی جانے والی تیاریوں کا حصہ ہے۔ تاکہ یہاں کا دورہ کرنے والے سیاح وسیع اور معیاری تجربہ حاصل کریں۔ ثقافتی منصوبوں بشمول قومی عجائب گھر، نمائش اور دیگر سرگرمیاں منعقد کرنے والی ماہر کمپنی سمایا انویسٹمنٹ کا بھی یہی ہدف ہے کہ سیاحوں کے لیے معیاری تقریبات کا اہتمام کیا جائے۔ سمایا کے سربراہ فواض المرج نے بتایا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سفر ہجرت کو فضا سے فلم بند کرنے اور پینارامک فوٹو گرافی کے لیے جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گذشتہ سال ۲۰ دسمبر کو لانچ ہونے والے پروجیکٹ کے پہلے مرحلہ میں ٹیم نے ان مقامات کی نشاندہی کی جن سے سفر ہجرت کے دوران آپ گذرے تھے جن میں غار ثور سے لے کر مدینہ میں مسجد قبا تک ۴۰ جگہیں شامل ہیں۔ فواض المرج نے بتایا کہ سفر ہجرت کے راستہ کو دستاویز کی شکل دینے کا خیال اس وقت آیا جب وہ اس بات پر غور کر رہے تھے کہ جبل ثور ثقافتی سینٹر میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہجرت کے واقعہ کو کس انداز میں پیش کیا جائے۔؟ ہجرت کا سفر بنیادی طور پر پینارامک فوٹو گرافی ۳۶۰ کا استعمال کرتے ہوئے ریکارڈ کیا گیا ہے۔ جبکہ اس کے دوسرے مرحلہ میں تمام مقامات کو فور کے ڈرونز کے ذریعہ ریکارڈ کیا جائے گا۔ سمایا کے سربراہ نے بتایا کہ اس پروجیکٹ کے دوران سب سے زیادہ مشکل ناہموار سڑکوں کے باعث پیش آئی اور اس وجہ سے بھی کہ بہت سے تاریخی مقامات کے نام وقت کے ساتھ تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس پروجیکٹ کی تحقیق کے لیے اسلامی تاریخ اور پیغمبر اسلام کی سوانح عمری کے متعدد ماہرین سے مدد حاصل کی گئی جن میں پروفیسر محمد بن اسلام اور مکہ کی ام القریٰ یونیورسٹی کے پروفیسر سعد بن الموسیٰ بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ریاض کی امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی کے پروفیسر سلیمان بن عبداللہ السویکت اور پروفیسر عبدالعزیز بن ابراہیم العمری نے بھی اپنی خدمات پیش کیں جو اٹلس بائیو گرافی آف پرافٹ کی سائنسی کمیٹی کے ممبران میں بھی ہیں۔ پیغمبر اسلام کی سوانح عمری اور مدینہ کے اہم مقامات پر مہارت رکھنے والے پروفیسر عبداللہ بن مصطفی نے بھی پروجیکٹ کے کچھ حصوں میں حصہ لیا۔ (صحافت، دہلی ۲۴، ۱، ۲۲ء)

ڈائناسور کی عمر و بیماری کے متعلق ایک حیرت انگیز انکشاف

ڈائناسور کے رکازات (فوسلز) پر ایک دلچسپ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ۱۵۰ ملین سال پہلے ڈائناسور زندہ تھے۔ وہ بھی آج کی طرح برڈ فلو جیسی بیماری میں مبتلا ہوتے تھے۔ سائنٹفک رپورٹ میں شائع تحقیق سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان غیر طائر ڈائناسوروں کے زمانہ میں سانس کی بیماریوں کا وجود تھا جن کی نسل ۶۵ ملین برس پہلے ختم ہوئی۔ اس قسم کے ڈائناسور ۱۴۵ ملین برس پہلے جوراسی عہد میں رہا کرتے تھے جو ڈائناسوروں کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ یہ چھپکلی کے پیروں والی نسل کے تھے۔ گھاس کھاتے تھے۔ ان کی گردن لمبی ہوتی تھی۔ ان کا سائنسی نام 7029MOR ہے اور جس کو ڈولی کا لقب دیا گیا ہے۔ ان کے رکازات کا انکشاف ۱۹۹۰ء کی دہائی میں امریکہ کے شہر مونٹانا میں ہوا تھا۔ (الوطن، بحرین ۱۲، ۲، ۲۲ء ص ۱۶) (ک۔ ص۔ اصلاحی)

وفیات

مولانا عتیق الرحمن سنبھلی

ممتاز عالم دین اور مصنف مولانا عتیق الرحمن سنبھلی (عمر ۹۲ سال) ۲۳ جنوری کو داغ مفارقت دے گئے۔ موصوف مولانا منظور نعمانی کے بڑے صاحبزادے تھے لیکن ان کی اصل پہچان ''الفرقان'' کی عرصے تک ادارت اور مختلف کتابوں کے مصنف کے طور سے تھی۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۷ میں فراغت کی۔ وہ خرابیٔ صحت کی وجہ سے سنہ ۱۹۷۶ میں لندن منتقل ہو گئے تھے اور تقریبا چالیس سال کے بعد وطن واپس آئے اور دہلی میں اپنے بیٹے کے پاس مقیم رہے۔ وہ مسلم مجلس مشاورت کے بانی ممبران میں سے تھے اور اس کے ہم خیال جریدہ ''ندائے ملت'' کی ادارت سے وابستہ تھے۔

مولانا عتیق الرحمن بہت منجھے ہوئے صاحب قلم تھے۔ وہ سادگی اور سادہ طرز زندگی کے پیکر تھے۔ ایک روایتی معاشرے کے فرزند ہونے کے باوجود مولانا عتیق الرحمن کھلی سوچ کے حامل تھے اور اپنی رائے کو برملا کہتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں ۶ جلدوں پر مشتمل ''محفل قرآنی'' نامی تفسیر اور ''واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر''، ''انقلاب ایران اور اس کی اسلامیت'' اور ''حیات نعمانی'' (مولانا منظور نعمانی کی سوانح حیات) شامل ہیں۔ سیکولرزم کے بارے میں ایک بار انہوں نے لکھا کہ مسلمان ممالک اسلامیہ میں سیکولرزم کی مخالفت کرتے ہیں جبکہ ہندوستان میں اس کی دہائی دیتے ہیں۔ انہوں نے لکھا کہ یہ دو طرفہ معاملہ نہیں چلے گا۔ یا تو مسلمان ہر جگہ سیکولرزم کو قبول کریں یا پھر ہندوستان میں بھی سیکولرزم چھوڑ کر دوسرے درجے کے شہری ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔ مولانا عتیق الرحمن خلوص، سادگی، شرافت اور وضع داری میں یادگار سلف تھے۔ آپ کی تدفین ۲۴ جنوری کو آبائی وطن سنبھل میں ہوئی۔ اللہ تعالی مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا کریں۔

ظفرالاسلام خان

تبصرۂ کتب

سوز و گداز زندگی: از پروفیسر عبدالحق، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش صفحات ۳۱۰، قیمت ۵۰۰ روپئے پتہ:۲۳۱۵/۱۵ ہڈسن لائن کنگز وے کیمپس، دہلی۔۹ سال اشاعت ۲۰۱۹ فون نمبر: ۹۳۵۰۴۶۱۳۹۴

جس زندگی کی بنیاد اقدار پرستی کے یقین و ایمان پر ہو، جس زندگی نے ہمیشہ ادب و دانش کو اعلی اخلاقی قدروں کا ترجمان تسلیم کیا ہو، اور اسی کے متعلق یہ عقیدہ بھی ہو کہ اعلی اخلاقی قدروں سے چشم پوشی کذب و کتمان حق کا سب سے مکروہ حیلہ ہے، جس کی زبان اور جس کے قلم کی زبان کا وظیفہ ہمیشہ یہ رہا ہو کہ تخلیق و تنقید ہو یا تحقیق، یہ سب فروغ حق کے لئے ہیں علوم کی تحریم و تقدیس بس اسی سے ہے، ایسے صاحب فکر کی زندگی کو حق ہے کہ اسے سوز و گداز کے تمام مفاہیم کے ساتھ ایک اسوہ و نمونہ کی شکل میں دیکھا جائے۔ دیکھنے کے زاویے الگ ہو سکتے ہیں، اقبال، شبلی، خسرو، رومی، زاویوں کی کمی نہیں، جن سے قلم کی کج روی کو پاک کرنے، باطل کی زیاں کاری سے محفوظ رہنے اور حق و باطل کی کشاکش سے نبرد آزما ہونے کی قوت ملتی ہے، جس کا دوسرا نام اقدار پر ایمان ہے۔ یہی ایمان اور عقیدہ کا استحکام، عبارتوں کو آیتوں جیسا تقدس اور تبحر عطا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک عام بات بھی کیسے گہر بار بن جاتی ہے، مثلاً یہی جملہ کہ ”ناخواندگی نام نشاں سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے“۔ یہ مبتدا ہے تو خبر بھی اسی درجہ کی کہ ”شجرہ کیا خود اپنی زندگی کے حوادث بھی حافظے سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ بات کرنے کا یہ فن قلم کی زبان کو یوں ہی نہیں جادو بیان بناتا اس کے لئے سوز و گداز زندگی کی نعمت پانے کی دعاؤں کو لبوں کے دروازے پر آنا ہوتا ہے۔ اس کتاب کے فاضل و صاحب دل مرتب صرف غالب، شبلی و اقبال کے افکار و تخیلات کے عارف ہی نہیں ہیں، ان کی فکر و نظر نے خود بھی مقامات آہ و فغاں کی تلاش و جستجو میں نشاط روح کا سامان پایا ہے۔ اس کتاب میں ان کے قدردانوں کے اسی قسم کے احساسات و تاثرات کو یہ کہہ کر یکجا کر دیا گیا کہ یہی تاثرات ایک فاضل جلیل کی لوحِ جبیں کے اشارات ہیں۔ پروفیسر صاحب کی متعدد کتابوں پر برصغیر کے کئی مشاہیر کی تحریریں، الگ الگ فکری موسموں کا لطف دیتی ہیں۔ ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی مرحوم کا مضمون ذرا طویل ہے۔ ممدوح کی مرقع آرائی میں خود مرحوم کا عکس عجب کچھ لطف رکھتا ہے۔ وہ اپنے ممدوح کے اسلوب کی مداحی کو مدلل کرتے ہوئے بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں جیسے ”واضح رہے کہ علمی باتیں غیر علمی انداز میں نہیں کہی جا سکتیں،..... عربی و فارسی الفاظ کا کثرت استعمال، ادب عالیہ کا نقص نہیں بلکہ اس کی خوبی ہے...... آج اردو زبان کو مقامی رنگ دینے کی خاطر عربی و فارسی الفاظ کو خارج کیا جا رہا ہے.... ضروری ہے کہ شبلی، آزاد، مہدی جیسے منفرد انداز نگارش رکھنے والوں کی تحریروں کو نہ صرف باقی رکھا جائے بلکہ ان کی قدر افزائی کی جائے۔ یہ لسانی فلسفہ ہے کہ عالمی زبانوں کو مقامی رنگ نہیں دیا جا سکتا“۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے ایک جگہ

پر شکوہ اور عالمانہ زبان اور عبارت آرائی کے لہجہ کو قند و نبات کی طرح قاری کے ذہن میں گھلتے جانے سے تعبیر کیا ہے۔اس طرح کتاب کے مضامین محض کتابوں کا تعارف ہی نہیں، مواد، اسلوب، زبان اور لہجہ کے متعلق افادات کی نعمت بھی عام کرتے جاتے ہیں۔ لکھنے والوں میں بڑے چھوٹے سب شامل ہیں جن کے افکار و گفتار کو حرز جاں بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ شروع میں خود پروفیسر صاحب کے قلم سے ان کی داستان زندگی مختصراً پیش کی گئی ہے، لیکن اس اختصار پر کتنی ہی تفصیلات قربان کی جاسکتی ہیں، ''والد پردیسی تھے کبھی دیس آتے تو باد نفس کی موج کی طرح گزر جاتے، ایسے میں ماں ہی جان و تن کی نگراں بنیں''۔ماں کا تذکرہ بھی کیا ہے، ماں کی یادوں کو سرمایہ جاں کہنے اور روح کو تڑپانے میں ان کی تاثیر پر خدا جانے کتنوں کی زبان پر یہی حرف حق جاری ہو سکتا ہے کہ ماں کے سایہ میں ہر پل زندگی کا سب سے خوشگوار لمحہ بن جاتا ہے۔ فاضل مولف کی ہر کتاب کی طرح یہ مجموعہ بھی قدر کے لائق ہے۔اردو کے ادب عالیہ کی یہ متاع گراں ہے۔

ادبی ہستیاں و بستیاں، کچھ یادیں، کچھ باتیں: از جناب احمد ابراہیم علوی، متوسط تقطیع عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۸، قیمت ۳۵۰ روپئے۔ پتہ: احمد ابراہیم علوی، ۳۔ ہیلتھ اسکوائر، لکھنؤ۔۳ اور جناب عارف علی انصاری بک سیلر، لطیف مارکیٹ، خیر آباد، سیتاپور۔ یو.پی۔ سنہ اشاعت ۲۰۲۰ء

اردو صحافت یا لکھنوی صحافت یا روایتی صحافت کی گفتگو میں برسوں پہلے ایک نمایاں نام اس کتاب کے مصنف کا زبان پر بے اختیار آجاتا تھا اور اب تو صرف یہی نام ہے، لکھنؤ کی اردو صحافت سے ایسا خاندانی اور قدیم رشتہ شاید ہی کسی اور کے نصیب میں آیا ہو، قومی آواز ہو یا آگ ہو یا ان دونوں کے درمیان کچھ اور نام ہوں، علوی صاحب اک جدا شناخت کا اعلان کرتے رہے، اور اب زیر نظر کتاب سے یہ اعلان بھی ہوتا نظر آتا ہے کہ وہ بلند پایہ صحافی ہونے کے علاوہ ایک خوبصورت اسلوب کے حامل ادیب و انشاپرداز بھی ہیں لکھنؤ کی صبحوں اور شاموں کا حسن ان کی تحریروں میں اس طرح سمٹ آیا ہے کہ کتاب کا پہلا صفحہ آخری صفحہ تک ایک ہی نشست میں قاری کا سفر طے کرا دیتا ہے۔ دو چار مضامین الگ کر دیں تو قریب ساٹھ مضامین لکھنؤ کی شخصیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ بہت مشہور اور کچھ کم معروف ہیں، سجاد ظہیر، نورالحسن ہاشمی، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، حکیم عبدالقوی، رضا انصاری، شوکت صدیقی وغیرہ مشاہیر کے ساتھ لکھنؤ کی بزم دوشیں کے منشی نول کشور، افق لکھنوی، ظفر الملک علوی، منشی سجاد حسین بھی موجود ہیں۔ مجاز، ماچس، منور رانا، منظر سلیم وغیرہ بھی اس بزم میں نظر آتے ہیں۔ بے تکلفی، سچائی اور بے باکی نے شخصیتوں کے مطالعہ میں جان ڈال دی ہے۔ ثبوت کے لئے عصمت چغتائی کا ذکر کافی ہے۔ والی آسی کے والد مولانا عبدالباری آسی الدنی کے تذکرہ میں ان کے تیار کردہ لغت تذکیر و تانیث کا ذکر ہے۔ یہ واقعی افسوس کی بات ہے کہ اس کتاب کا مسودہ غائب ہو گیا۔ علوی صاحب کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ایک قابل قدر ادبی کاوش ناقدری کی نذر ہو گئی، مگر یہ لکھنا شاید درست نہیں کہ مولانا دریابادی ہر جمعہ کو لکھنؤ سے دریاباد جاتے تھے،

ہمارے علم میں حکیم عبدالقوی دریابادی کا جمعہ کو دریاباد آنا اور سنیچر کی صبح کو جانا ہے، حکیم عبدالقوی کے متعلق البتہ یہ قطعی درست ہے کہ عادات وخصائل سے انہوں نے سوائے اچھے کام کرنے کے اور کچھ نہ کیا۔ مرزا رسوا کے بارے میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جو شاید بہت کم لوگوں کے علم میں ہوں، سجاد ظہیر کا یہ وصف بیان کیا کہ وہ شدید اختلاف رکھنے کے باوجود مخالف کی باتیں بڑی توجہ سے سنتے تھے، ان کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی کہ دوسروں کو جس حد تک سمجھ سکتے ہیں سمجھیں۔ کہیں کہیں ان کے صحافیانہ تیور کی نمائش بھی ہو جاتی ہے۔ احتشام حسین کے ذکر میں ان کے بعد کے ناقدین کی بات میں وہ لکھتے ہیں کہ عمل تنقید ایک فیشن بن گیا، ہر اس ادیب نے جو ذرا بھی اہمیت رکھتا، تنقید کو گھر کی باندی تصور کیا، اس طرح تنقید کوئی باوقار فن کے بجائے ایک ایسا معیوب طرز تحریر ٹھہرا کہ لوگ اس سے کشاں کشاں رہنے لگے..... اس طرح کئی حضرات نے اپنی عظمت کاٹ پنجیوں سے لوہا تو منوالیا مگر ادب کو نقصان پہنچا بھی دیا۔ صحافت کا ایک مفہوم صداقت ہے، شوکت صدیقی خدا کی بستی والے کے ذکر میں سچائی یوں سامنے آئی کہ ادبی سوداگر جوہرا یرے غیرے کو اعزاز عطا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں کہ ان سے ان کو دینے سے زیادہ لینے کو ملتا ہے کبھی سچے فن کار کی قدر نہیں کرتے۔ شخصیات کے مطالعہ میں گہرائی اور اظہار میں سچائی نے اس مجموعہ مضامین کو واقعی مفید تر بنا دیا۔ ایک مضمون ذراہٹ کے، باون گز کا کوئی نہیں کا عنوان لئے ہوئے ہے۔ اس میں اردو کی کتابوں کی اشاعت، اردو قارئین کی کمی وغیرہ پر کھری کھری باتیں آگئی ہیں، جیسے تنگ نظری، تعصب، پست ہمتی، ہمت شکنی اور دوسروں کی ترقی اور ناموری سے خائف رہنے کی عادت، آج اردو والوں کی عام روش ہے، اس مضمن کو بار بار پڑھا جانا چاہئے، خصوصاً ان کو جو اردو کی بقا اور تحفظ کا سرکاری ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ یہ مضمون ہی کیا پوری کتاب بار بار اسی طرح پڑھنے کے لائق ہے جس طرح شرر کی گذشتہ لکھنؤ اور مرزا جعفر حسین کی کتب لکھنویات، یہ صرف لکھنؤ اور اردو کا مرثیہ ہی نہیں ایک اعلیٰ تہذیب کے گم ہوتے وجود کی بازیافت کی کلید بھی ہیں۔

وفیات اطباء ہند و پاک جلد اول : از حکیم وسیم احمد اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۲۰۔ قیمت: ۱۹۴؍ روپئے۔ پتہ: ادارہ کتاب الشفاء ۲۰۷۵، کوچہ چیلان، دریا گنج نئی دہلی۔ ۲۵، اور ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ یو.پی، سال اشاعت ۲۰۱۹ء

طب مشرق یا طب یونانی یا طب اسلامی میں ادھر علمی و عملی دونوں طرح ایک نئی زندگی کا خوش گوار منظر نمایاں ہے، طبّی دواخانوں اور دواؤں میں بھی اضافہ ہوا ہے اور یہ اس کی افادیت کا بھی ایک اعلان و اقرار ہے۔ علمی لحاظ سے بھی ایک رونق نظر آتی ہے۔ اسی رونق میں ایک خوبصورت اضافہ پیش نظر کتاب ہے۔ جس میں برصغیر کے اطباء کے سوانح کو تاریخ وتذکرہ کی کتابوں کی مدد سے طرز جدید کی وفیاتی فہرست کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ کام غیر معمولی مطالعہ کا متقاضی ہے۔ محنت و جستجو کا اندازہ کرنا بھی

مشکل ہے۔ برصغیر میں صدیوں سے اس طب کی صرف نمایاں و نمائندہ شخصیتوں کا شمار کیا جانا گویا تاروں کو گننا ہے، پھر ان کے حالات کا انتخاب کچھ کم دماغ سوزی نہیں۔ اس کتاب کے فاضل محقق و مرتب کی عالی حوصلگی ہے کہ انہوں نے یہ بار گراں اپنے ذمہ لیا، اور اس پہلی جلد سے یہ ثابت کیا کہ وہ اس ذمہ داری کے واقعی اہل ہیں۔ یہ پہلی جلد ہے، حروف تہجی کے اعتبار سے اس میں حرف الف سے شروع ہونے والے اطباء کا ذکر ہے۔ قریب تین سو صفحات میں پیدائش، وفات، تعلیم اور طب سے تعلق، یہ معلومات کا بنیادی جزو ہیں۔ وفیات نگاری کی روایت و اہمیت فاضل مصنف سے مخفی نہیں، اس لئے ان کا یہ کہنا محض دعویٰ نہیں کہ ''طب یونانی میں وفیات الاطباء کے عنوان سے کوئی مستقل کتاب میرے علم میں نہیں'' حکیم صاحب نے تذکرۃ الاطباء کو وفیات سے الگ کر کے جن تذکروں کا نام لیا ہے وہ خود ان کے علم کی وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے نزدیک تذکراتی ادب الگ ہے، اس بات کی وضاحت کے لئے انہوں نے پیش نامہ میں جس طرح اس موضوع پر معلومات مہیا کئے ہیں وہ بجائے خود بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اصل کتاب میں تحقیق کا حق یوں ادا کیا گیا کہ کوئی بات بغیر حوالے کے نہیں مصادر کی نشان دہی اس طرح ہے کہ کسی اور حوصلہ مند کے لئے ان تک رسائی بہ آسانی ہو جائے۔ کتاب کا اسلوب بھی ذوق و شوق کو قوت و توانائی دیتا ہے۔ البتہ اتنی اچھی کتاب میں کمپوزنگ کی غلطیاں اچھی نہیں لگتیں، بعض تعبیرات میں جدت ہے جیسے حکیم آغا جان عیش کے متعلق یہ جملہ ہے کہ ''مرزا فرحت اللہ بیگ بھی ان کی ادبی توقیت کرتے نظر آتے ہیں''۔ اس تحریر میں ایک جگہ شعری تغذیہ کرنا آیا ہے، یہ یقیناً تجزیہ ہے۔ عیش کی امتیازی خوبیوں کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں کہ ''ان تمام خوش فعلیوں کے ساتھ..... کمالات کو خوش فعلی تصور کرنا، کچھ عجب سا ہے۔ ایک کتاب کی اشاعت میں سن اشاعت درج نہیں، اس کو ''غیر مورخ'' لکھا گیا، ایک جگہ لکھا گیا کہ ''انہوں نے امداد لینے سے منع کر دیا'' یہاں بجائے منع، انکار شاید بہتر ہوتا۔ معمولی فروگذاشت یا سہو کتابت کی مثالیں اپنی جگہ، لیکن خوبیاں سطر سطر سے نمایاں ہیں، باتوں باتوں میں بڑے کام کی چیزیں آجاتی ہیں جیسے حکیم سید محمد ابراہیم کے متعلق لکھا کہ وہ دبستان لکھنؤ کے پروردہ تھے اسی لئے علاج بالمفرد کے پیرو تھے۔ خوبصورت جملے جا بجا ہیں جیسے ''ان کے یہاں قدامت کا احترام بھی تھا اور اس سے صالح انحراف کی جرأت بھی..... وہ روایتوں کے لہو کو جدید خاکوں میں بھرنے کے حامی تھے'' مراجع سے استفادہ کے ساتھ ان کے اغلاط کی نشان دہی بھی کی گئی ہے، جیسے تذکرہ علمائے اعظم گڑھ میں حکیم ابو محمد دیوگامی کی طبّی تعلیم گاہ کا نام وہاجیہ کالج لکھا گیا ہے'' مصنف نے لکھا کہ یہ صحیح نہیں، اصل نام مدرسہ طبیہ وہاجیہ ہے۔ اپنے منفرد موضوع اور نہایت پر مشقت مطالعہ و تحقیق اور سلیس و شگفتہ انداز تحریر کی وجہ سے یہ کتاب قدر و احترام و استفادہ کا حق رکھتی ہے۔

تصانیف شبلی کے تراجم: از: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات

۲۲۴، قیمت : ۴۰۰روپئے ، پتہ: مکتبہ دارالمصنّفین اور مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی۔ سن اشاعت ۲۰۲۱ءفون نمبر :۹۸۳۸۵۷۳۶۴۵

علامہ شبلی اور شبلیات کی دنیا پہلے بھی آباد تھی، کتابیں تھیں، مضامین تھے، علامہ کے معاصرین، ان کے احباب، ان کے تلامذہ سب نے اپنی زندگی کی متاع علمی میں شبلی کی یاد اور ان کے ذکر کو شامل کرنا گزیر سمجھا، مگر الیاس صاحب پر فیضان شبلی کچھ اور ہی انداز میں ظاہر ہوا، ان کے لئے شبلیات کا ہر گوشہ اور ہر پہلو جیسے روحانی طور پر کھول دیا گیا، نتیجے میں شبلیات کی دنیا کچھ اور نظر آنے لگی، اس کی تفصیل سے معارف اور ہندوستان کا ہر باذوق قاری واقف ہے۔ تلاش و جستجو، اخذ و جمع، تدوین و تعلیق اور پھر طبع واشاعت کے ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے نے ماہر شبلیات کی سند عطا کر ہی دی، ان کی ہر کتاب، شبلیات کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کا درجہ پاتی گئی۔ اسی ذخیرہ میں زیر نظر کتاب بھی ہے جس میں علامہ کی کتابوں کے ترجموں کو شمار کر کے مترجمین کے بارے میں بھی معلومات پیش کر دیئے گئے۔ یہ بات تو عام تھی کہ علامہ کی کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں لیکن یہ تفصیل قطعی عام نہیں تھی کہ سیرۃ کے پینتیس، الفاروق کے تیس، شعر العجم کے اٹھارہ ترجمے ہوئے۔ اس طرح کے حیرت انگیز معلومات ہیں جن کا بیان مصنف نے حرف آغاز میں کیا ہے ۔ یہاں ان کو مختصراً بھی دہرا نہیں سکتے ۔ مصنف کے مطابق یہ ان کے سلسلہ مطالعات کی انیسویں پیش کش ہے۔ یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ان کی ہر نئی کتاب خوب تر کا اعلان کرتی جاتی ہے۔

دیوان وجیہ : از: مولانا وجیہ الدین احمد خاں قادری رامپوری، مرتب ڈاکٹر محمد شعائر اللہ خاں وجیہی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۴ قیمت: ۲۰۰روپئے پتہ: مکتبہ وزیریہ ۴۸، انگوری باغ، رامپور، یو.پی۔ ۲۴۴۹۰۱ اور رام پور دہلی ، پھلواری شریف اور کریم گنج آسام کے مکتبے ، سال اشاعت ۲۰۱۸ءفون نمبر :۹۴۱۲۳۳۶۴۱۱

دارالسرور رامپور کی شاندار علمی وادبی تاریخ میں مولانا وجیہ الدین قادری کی ہستی، برکتوں کے ظہور کی ایک حقیقی شکل ہے، مولانا حافظ و عالم تھے، پایہ کے محدث تھے، درس وتدریس کے مشغلہ کے علاوہ وعظ و خطابت میں ان کا شہرہ دور دور تک رہا، ایک صدی پہلے کے علماء کی طرح نثر نگاری اور شعر گوئی کی نعمت بھی ان کو ودیعت ہوئی۔ رامپور کی فضا تھی بھی ایسی کہ علوم و معارف اور شعر وادب کی یکجائی، تعجب کے لائق نہ تھی۔ مولانا وجیہ نے بھی اسی فضا سے متاثر ہو کر مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی، طبع رواں ہو تو زبان کی بھی قید نہیں رہتی اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی شعری صلاحیتوں کے جوہر سامنے آگئے۔ غزلیں کہیں تو اسی رنگ میں ڈوب کر جس کے لئے دبستان رام پور کو ناز ہے۔

وہ نیچی نظروں سے مسکرانا وہ ابرووں کا اٹھا کے چلنا

کھنچا ہے نقشہ مری نظر میں کسی کا ان کو مٹا کے چلنا
افسانہ فسوں کو فراموش کر چلے
آنکھوں میں اپنی جادوئے بابل لئے ہوئے
شیشہ دل کو مرے توڑتے ہی جوڑ دیا
ترچھی نظروں سے کہا کون ہے یہ دیوانہ

لیکن غزل کا یہ کوچہ ان کے لئے تھا ہی نہیں، مجاز تو حقیقت کی راہ میں بس ایک موڑ تھا، اس کے بعد مناجات اور نعتوں کے نذرانے تھے۔ مناجات کا انداز دیکھئے۔

اللہ اپنے خانہ خرابوں کی لیں خبر ہم ہیں شکستہ حال پریشاں ملول تر
اے رحمت تمام اِدھر لطف کی نظر یہ ہے مرادِ دل بہ تقاضائے چشم تر
یا صاحب الجمال و یا سید البشر

لائق تحسین ہیں مرتب دیوان جنہوں نے بڑے سلیقے سے اپنے قابل فخر نانا کی دعاؤں اور مناجاتوں میں دوسروں کو شریک ہونے کا موقع دیا۔

متاع شمیم : از: جناب شمیم بارہ بنکوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گردپوش، صفحات ۱۰۴، قیمت: ۱۰۰ روپئے پتہ: دانش محل، امین آباد لکھنؤ، محمد شمیم خاں، موضع بیبیاپور، ڈاکخانہ ہنہنہ، ضلع فیض آباد، ڈاکٹر انور حسین خاں، ڈاکخانہ نیورہ ضلع فیض آباد اور بارہ بنکی، فیض آباد، علی گڑھ کے بعض مکتبے، سال اشاعت ۲۰۱۹ء فون نمبر: ۹۹۳۶۳۱۸۵۴۱

جناب شمیم بارہ بنکوی ان شعراء میں شامل ہیں جن کی قسمت میں شہرت کی دولت کم آئی لیکن وقعت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ان کے کلام کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، ان کو شعور ذات کی نعمت حاصل ہے، اسی لئے ایک اچھے استاذ کی تعریف کے پردے میں انہوں نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ :

اجاگر جس سے ہر اک انجمن ہے مری ہستی وہ شمع علم و فن ہے

زیر نظر مجموعہ کلام بہت مختصر ہے، قریب پچاس کی تعداد میں حمد و نعت اور غزل و نظم ہیں۔ شاید اسی لئے اس کو متاع سے تعبیر کیا گیا کہ ذہن فوراً متاع حیات دنیا یا متاع قلیل کی تعبیرات کی جانب منتقل ہو جائے۔ نعتیں خاص طور پر جذبات کا بہترین مظہر ہیں۔

خاک قدم سید کونین کے صدقے گلزار درآغوش ہے صحرائے مدینہ
ایسا تو نہیں کوئی مجھے پوچھ رہا ہے سینے میں مچلتی ہے تمنائے مدینہ

رہی غزلوں کی بات تو اس میں نعت والی احتیاط اور ہوش کی قید نہیں، اس میں تخیئل اور جذبہ دونوں کی مہلت بھی ہے اور سہولت بھی اور سلیقہ اظہار کی مہارت ہو تو ایسے شعر حیران نہیں کرتے کہ

ترک تعلق تیری مرضی خواب میں لیکن آنا چھوڑ
خاموش محبت کے سوالوں میں رہے وہ سرشار محبت کے جوابوں میں رہے ہم
کیا گور غریباں میں نظارہ عبرت ہے آبادی کی آبادی ویرانے کا ویرانہ

پاکیزہ جذبات، کلاسیکی رکھ رکھاؤ اور عصری احساس سب کچھ کسی قادرالکلام میں پانا ہے تو متاع شمیم، متاع بے بہا ہے۔ اس خوبصورت مجموعہ اشعار کی طباعت کے محرک اور معروف ادیب و نقاد ڈاکٹر انور حسین نے صحیح لکھا ہے کہ جناب شمیم کی شاعری میں ان کے جذبات کی طہارت اور الفاظ کی صداقت بدرجہ اتم موجود ہے۔

مولانا آزاد، سرسید کے بارے میں : از: ڈاکٹر شائستہ خان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۰۸ قیمت : درج نہیں، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء ایمیل: kboplibrary@gmail.com

سرسید کے حوالہ سے مولانا آزاد کی تحریروں، تقریروں اور خیالات کی دنیا کی سیر بہت دلچسپ ہے۔ یہ کتاب اسی بات کا ثبوت ہے، مرتبہ کتاب نے بات ہی یہاں سے شروع کی کہ سرسید کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد سرسید کے مخالف تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سرسید سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔ اختلاف تھا تو اس پالیسی سے کہ مسلمان سیاست میں حصہ نہ لیں۔ اس اختلاف میں دونوں کے لئے حرف جواز بھی خوب تلاش کیا گیا۔ سلسلہ کلام جاری ہوا تو بتایا کہ مولانا آزاد حیات جاوید کے لئے کتنے بے قرار تھے۔ جب حیات جاوید پر سرعبدالقادر اور مولانا شروانی کی تنقیدیں آئیں تو مولانا آزاد تنقید التنقید لے کر آ گئے۔ انہوں نے ہی سرسید کو سرسید اعظم کا خطاب دیا، اپنے دوست کو لکھا کہ سرسید میرے حواس پر چھا گئے ہیں۔ اب ایسے عقیدت مند کو کیسے کہا جائے کہ وہ سرسید کا مخالف ہے۔ ڈاکٹر شائستہ نے یہ سب ظاہر کرنے کے بعد لکھا کہ بعد میں مولانا نے سرسید کی مسحور کن شخصیت کے اثر سے نکل کر اپنی آزاد شخصیت قائم کر لی۔ اس میں کچھ اثر علامہ شبلی کا بھی تھا۔ مگر اس کتاب میں کہیں اس اثر کا کوئی اثر نہیں ملتا، ہاں لسان الصدق میں سرسید اور حالی و شبلی کے بارے میں جو طبع ہوا اس کو اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ دربار سید اعظم اور حیات جاوید پر تبصرہ وغیرہ سے بھی یہ کتاب قیمتی ہو گئی ہے۔ کتاب کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ اس میں سید قدرت اللہ فاطمی کے نانا محمد یوسف رنجور کے نام مولانا آزاد کی کچھ تحریریں پہلی بار پیش کی گئی ہیں جن سے آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، کے بیانات کی توثیق ہوتی ہے اور یہ مولانا آزاد پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یقیناً دلچسپی کی بات ہے۔ (ع۔ص)

سفر کی خوشبو (سفرنامہ): ڈاکٹر شکیل احمد، کاغذ طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۰۸، پتہ۔ مکتبہ الفہیم، صدر چوک، دھوبیا املی روڈ، مؤناتھ بھنجن، یو۔پی قیمت: ۱۸۰؍ روپے۔ ۲۰۲۰ء۔

موبائل نمبر: ۹۲۳۶۷۲۲۵۷۰

ڈاکٹر کیول دھیر کا سفر نامہ پاکستان خوشبو کا سفر کے نام سے بہت پہلے ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا تھا اور انہوں نے پاکستانی ادیبوں، شاعروں، مدیروں، صحافیوں اور عام و خاص لوگوں کے حالات اور لاہور اور اس کی گلی کوچوں کے کوائف و مناظر کی خوشبو بکھیری تھی اور اب اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی، سمٹتا سائبان اور حساب جاں جیسی ادبی، سوانحی اور مفید و کار آمد کتابوں کے مصنف ڈاکٹر شکیل احمد ''خوشبو کا سفر سفر نامہ'' لے کر حاضر ہیں۔ موضوع اور نام میں بڑی حد تک یکسانیت اور مماثلت کے باوجود دونوں کی معنویت میں فرق و تفاوت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ زیر تبصرہ کتاب دراصل ان کے تعلیمی، ادبی اور حصول ملازمت کے مقصد سے کیے جانے والے بیشتر اسفار کی روداد ہے۔ جس کو انہوں نے بڑے سلیقہ سے سادہ و دلنشین اسلوب میں مرتب کیا ہے۔ کتاب کی ترتیب میں انہوں نے واقعات کے ساتھ ماہ و سال کے اندراج کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ واقعات سفر کے ساتھ حاصل سفر بھی لکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ گھوسی سے گورکھپور تک کے ہر مقام سفر کے حالات الگ الگ جلی عنوانات کے تحت لکھے ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں والد صاحب کے ساتھ صلاح آباد گاؤں کے پاپیادہ سفر سے خوشبو کے اس سفر کا آغاز ہوا تو اس ننھی عمر میں گھوسی تک کن کن گلی کوچوں اور گاؤں سے گذرے تعجب ہے سب کا نام بہ نام ذکر ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے۔ یہی حال ان کے دوسرے اسفار کا بھی ہے۔ واقعات سفر کی جزئیات لکھنے میں بھی ان کے قلم نے بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ سفر نامہ کی ترتیب کی وجہ تحریک یہ بتائی ہے کہ ''میرے درجنوں اسفار کے اس مجموعہ میں قاری کے لیے ممکن ہے ایسا کچھ مل جائے جو مجھے سفر ناموں کے مطالعہ کے دوران ملتا رہا ہے'' (ص ۸)۔ اعظم گڑھ کے سفر کو انہوں نے ''سفر نمونۂ ظفر'' سے تعبیر کیا ہے (ص ۳۳)۔ اس کی وجہ غالباً دار المصنفین سے علمی اور شبلی کالج سے ڈاکٹر صاحب کی تعلیمی وابستگی، ان دونوں اداروں میں ان کی بار بار آمد اور یہاں کے علما اور دانشوروں سے ان کے دیرینہ مراسم ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ اسفار زیادہ تر اتر پردیش کے ہی اضلاع میں ہوئے ہیں۔ یوپی کے باہر صرف پٹنہ اور دہلی کا سفر کیا ہے۔ اس لیے انہیں علاقوں کی علمی، تہذیبی، تعلیمی ، ادبی اور کچھ حد تک سیاسی حالات و کیفیات سے ہی قاری کو واقفیت ہوگی۔ دہلی کے سفر کے دوران آگرہ ، دیوبند، بجنور، مراد آباد وغیرہ کے سفر کا تذکرہ ضمناً کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک پختہ اہل قلم ہیں اگرچہ کم لکھتے ہیں۔ موضوع کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ معاشرہ کی سمجھ اور اچھی صلاحیت نے ملک و ملت کے دانشوروں، علما و فضلا، ادبا و شعرا اور ماہرین تعلیم اور ان کی سرگرمیوں کو سمجھنے میں مدد کی۔ اس کا اندازہ اسفار میں پیش کی گئی معلومات سے کیا جاسکتا ہے۔ واقعات سفر کے تذکرہ میں سلامت روی اور متانت کا دامن انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ پروف کی غلطیاں بھی ڈھونڈھنے سے ملیں گی۔

سب رنگ : طفیل انصاری۔ کاغذ طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۱۲، پتہ۔ طفیل انصاری مفتی محلہ ،جونپور ۔۲۲۲۰۰۱ ۔ قیمت : ۱۸۷ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ءموبائل نمبر: ۹۴۵۲۵۶۰۸۳۶

صاحب کتاب اس سے قبل حفیظ جونپوری۔حیات اور شاعری اور کلیات حفیظ کی ترتیب وتدوین وغیرہ کے ذریعہ علم وادب کے حلقہ میں اپنی علمی و تصنیفی لیاقت کا ثبوت بہم پہنچا چکے ہیں اور اب ادبی و تحقیقی ذوق کا ایک عمدہ نمونہ ''سب رنگ'' کی شکل میں لے کر حاضر ہیں۔ مختلف وقتوں میں لکھے گئے یہ ان کے ۲۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل لکھنؤ، علی گڑھ، کلکتہ ،حیدر آباد، جونپور اور کراچی وغیرہ سے نکلنے والے رسالوں اور روزناموں کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔ کتاب میں شامل کیا گیا سب سے پہلا مضمون سر شاہ سلیمان پر ہے جو اردو نئی دنیا، جونپور میں یکم نومبر ۱۹۷۹ء میں اور سب سے آخری مضمون "خوش فکر وخوش گفتار شاعر۔ معصوم انصاری" کے نام سے ہے جو زبان وادب ،پٹنہ میں ستمبر ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔اس طرح اس علمی سفر کو طے کرنے میں عمر نبوت صرف ہوئی ہے۔ مضامین کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ۔اول تا سوم میں ہر باب کے تحت ۸ اور چوتھے آخری باب میں ۹ مضامین ہیں ۔اول الذکر تین ابواب زیادہ تر ممتاز شعرا کے فکر وفن اور آخری باب مشہور علما وادبا کی علمی وادبی سرگرمیوں پر گفتگو کے لیے خاص ہیں۔ شاہ محمد عبدالعلیم آسی، شاہ غلام اعظم الٰہ آبادی، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کے علاوہ باقی تمام ادبا وشعرا کا تعلق شیراز ہند جونپور سے ہے۔ باب سوم میں اردو شاعری میں تضمین اور اشعار کی بازگشت پر مضامین عمدہ اور لائق مطالعہ ہیں۔اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مصنف نے بعض ایسی علمی وادبی شخصیتوں پر بھی قلم اٹھایا ہے جن پر پہلے سے کوئی مواد موجود نہیں تھا مثلاً البیلا فنکار محمد جمشید اور مصنف کے ہم دم۔ محمد خلیل وغیرہ پر شاید ہی کہیں کچھ مل پائے۔ محمد جمشید ماہر خطاط اور آرٹسٹ اور محمد خلیل سائنس کی دنیا، نئی دہلی کے مدیر رہے ہیں۔ان ہی شخصی مضامین کی فہرست میں بعض کتابوں مثلاً برمحل اشعار اور ان کے مآخذ اور تعلیمی نکات پر ایک نظر کے عنوان سے تبصرہ کو بھی شامل کردیا ہے جو الشیء علیٰ غیر محلہ کے مصداق معلوم ہوتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا طائر فکر ونظر محدود فضاؤں میں ہی سفر کا عادی اور اپنے علاقہ کی ہی فکری غذا کے حصول وشیوع پر قانع ہے۔۲۹ میں سے ۱۰ مقالات کے آخر میں حواشی ہیں۔ لیکن حواشی میں بھی حوالہ دینے کے جدید اسلوب وانداز کی اتباع کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر حواشی غیر مکمل ہیں۔ حالانکہ حوالوں کا اہتمام کرکے کتاب کے پایۂ استناد واعتبار اور اس کے معیار کو بلند اور اس کی قدروقیمت میں اضافہ کیا جاسکتا تھا۔ جدید انداز سے مراجع وحواشی کے اس عدم اہتمام کے سبب مصنف کے اس دعویٰ کہ ''فی الحقیقت ''سب رنگ'' کی علمی وادبی حیثیت دستاویز کے مانند ہے'' (ص۵) کی حقیقت واہمیت یقیناً کم ہوگئی ہے۔ آؤ بچو! کی جگہ ''بچوں'' (۲۱۳) اور کیلی گرافی کے بجائے ہر جگہ ''ہیلو گرافی'' (۲۹۵) وغیرہ جیسے لفظوں کے صحیح املا پر دھیان دینے کی ضرورت تھی۔ (ک۔ ص۔ اصلاحی)

ادبیات

وارث ریاضی

کاشانۂ ادب۔ سکٹا دیوراج پوسٹ بسوریا، وایا: لوریا چمپارن (بہار)
8228902546

نہ دے نسیم سحر مژدۂ بہار مجھے
نہیں گلوں کے تبسم پہ اعتبار مجھے

جناب حضرت موسیٰ بھی تاب لا نہ سکے
دکھا نہ اپنی تجلی تو بار بار مجھے

ہر ایک وعدۂ فردا کی خوش گمانی میں
تمام عمر رہا تیرا انتظار مجھے

سکونِ دل ہے ، تری خشم گیں اداؤں سے
نگاہِ لطف تو رکھتی ہے بے قرار مجھے

غرض پرست نظر آئے جس طرف دیکھا
ملا نہ کوئی جہاں میں وفا شعار مجھے

لبوں پہ مہر و اخوت ، دلوں میں بغض و عناد
ملے ہیں ایسے بھی احباب بے شمار مجھے

بنا نہ اپنی طرح مجھ کو واعظِ ناداں
ابھی تو لوگ سمجھتے ہیں خاکسار مجھے

جفا کے بعد بھی کرتا رہا وفا پہ وفا
نہیں ہے اپنی وفاؤں پہ اختیار مجھے

پتا نہیں مرے رہنما کو منزل کا
ملی ہے راہ محبت بھی خار زار مجھے

زمانہ بھر کی نگاہوں سے یوں گرا وارثؔ
کہ اپنی ذات سے آنے لگی ہے عار مجھے

غزل

جمیل مانوی

سہارنپور۔یو۔پی۔

موبائل:9837523815

عشق نہیں، ہوس ہے، جو روح کو روشنی نہ دے
دل کو شعورِ غم نہ دے، ذہن کو آگہی نہ دے

دل کے نصیب میں اگر قربتِ سرمدی نہ دے
میری سماعتوں کو بھی نغمۂ سرمدی نہ دے

آخری سانس تک رہے اپنے پرائے کی تمیز
میرے ضمیرِ عشق کو ہوش دے، بے خودی نہ دے

تیری نوازشوں کی خیر، تیری یہ حکمتیں عجیب
جس کو شعورِ غم بھی ہو، اس کو بھی اک خوشی نہ دے

قدرِ ہنر کا ذکر بھی، ترکِ وطن کی بات بھی
پہلوئے غم نصیب کو درد دے، تشنگی نہ دے

کچھ بھی نہیں یہ سازِ غم، کچھ بھی نہیں بہارِ غم
میرے دلِ تباہ کو خوابوں کی پالکی نہ دے

بیتی رُتوں کے درد بھی، اگلی رُتوں کے خواب بھی
ایسی رُتوں کے نام پر خود کو فریب بھی نہ دے

کون سی نعمتِ جہاں، تیرے لئے بھلا نہ دی
عشقِ بلا نصیب کو طعنۂ بے زری نہ دے

سارے چراغ بجھ گئے دل بھی جلا کے دیکھ لوں
اب یہ نصیبِ عشق ہے، دے کوئی روشنی نہ دے

ایسا نہ ہو کہ زندگی مہلتِ غم بھی چھین لے
میری سیاہ رات کو جلووں کی چاندنی نہ دے

اہلِ وفا کے ذکر پہ چہرے اتر اتر گئے
میں نے کہا نہ تھا کہ تو میری مثال بھی نہ دے

آ میری جانِ زندگی! جی بھر کے دیکھ لوں تجھے
ایسا نہ ہو کہ موت پھر فرصتِ دید بھی نہ دے

عشق کی بارگاہ میں حسن نے سر جھکا دیا
اب تو جمیلؔ حسن کو طعنۂ بے رخی نہ دے

معارف کی ڈاک

(۱)

معارف جنوری ۲۰۲۲ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ حصہ ادبیات کو چھوڑ کر شذرات، مقالات اور دیگر مشمولات پسند آئے۔ ''ادبیات'' میں ''ماتم گریزاں'' کی ترکیب، اس کا مفہوم اور اس عنوان کے تحت مندرج اشعار ناچیز کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہ قول مولانا حسرت موہانی (۱۹۵۱-۱۸۱۸۱ء):

شعر دراصل وہی ہیں حسرتؔ سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی ایک بین الاقوامی ادارہ ہے اور علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا علمی وفکری ادارہ اور معارف ایک خالص علمی دینی، تاریخی، تحقیقی اور ادبی رسالہ ہے۔ یہ روز اول سے جس معیار اور اسٹائل پر نکل رہا ہے اسی انداز پر نکلنا چاہیے۔ جہاں تک معارف کی زبان کو آسان کیے جانے کی بات ہے تو اس سلسلے میں ڈاکٹر شفقت اعظمی صاحب کا یہ خیال: ''مقالہ جتنا علمی اور تحقیقی ہوگا، زبان خود بخود بلیغ اور عالمانہ ہوتی جائے گی.........'' بالکل درست ہے۔ راقم ناچیز تقریباً ۴۵ سالوں سے معارف کا قاری ہے۔ اللہ شاہد اس دوران میں ایک خط بھی نظر سے نہیں گزرا جس میں معارف کی زبان کو آسان کرنے کی بات کہی گئی ہو۔

باب التقریظ والانتقاد کو کتابوں کے تبصروں میں شامل کیا جانا صحت مند انداز فکر نہیں ہے۔ تبصروں میں عام طور پر کتاب کا تعارف کیا جاتا ہے جب کہ باب التقریظ والانتقاد میں کتاب کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

وارث ریاضی

سکٹا، دیوراج، مغربی چمپارن، بہار
arshadsahaj@gmail.com

(۲)

اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی لائبریری سے استفادہ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، خاص کر ان طلبہ کے لئے جو تحقیق کا ذوقِ سلیم ابھی نہیں رکھتے ہیں۔ دار المصنفین بلاشبہ ایک عظیم ادارہ ہے اور رہے گا ان شاء اللہ، کسی ادارہ کی بقاء اس کے تیار کردہ افراد کے ذریعے ہی ممکن ہوتی ہے۔ ایک مختصر سی مثال: ہندوستان میں فکر فراہی کو لے کر وہ کام آج تک نہ ہو سکا جو پاکستان میں جاوید غامدی صاحب کی قیادت میں المورد کے ذریعے انجام پا رہا ہے۔ اس ادارہ میں اگرچہ مصنفین موجود ہیں لیکن یہ مصنفین کا دار نہیں بن سکا۔ دار تو وہ ہوتا ہے جہاں سے انسان ایک ایسی زندگی گزارتا ہے جو دوسروں کے لئے راہ نما بن جاوے، اور دار المصنفین کی تاریخ اس پر

شاہد ہے (کہ وہ ایک دار تھا) لیکن پچھلے برسوں میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر آپ مندرجہ ذیل تین باتوں پر غور و فکر کریں تو ان شاءاللہ اکیڈمی بیت الحکمت بن سکتی ہے۔

۱۔ اکیڈمی ایک تربیت گاہ بن جائے۔ تربیت گاہ سے مراد جس طرح یہاں بہت سے ریسرچ اسکالر ہوتے ہیں ایسے ہی نوجوان مصنفین کی تربیت کے لئے کورس یا پروگرام کی شروعات ہونی چاہیے۔ اسی سلسلے میں ایک اہم کام دارالمطالعہ کے ساتھ ریڈنگ روم بھی اکیڈمی میں ہونا چاہیے جو کم از کم 16 گھنٹہ طلبہ کے لئے کھلا ہو۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ یہ ریڈنگ روم سب کے لئے ہو لیکن مفت نہ ہو۔ دوسری بات اس کی ممبر شپ کے بعد ریڈنگ روم سے بک ایشو کا انتظام ہو۔ ہندی کتابوں کا عمدہ ذخیرہ ہو دیگر زبانوں کے ساتھ، دعوت دین کے لحاظ سے۔

آپ دلیل الباحث جیسی عمدہ کتاب کے مصنف ہیں۔ ہم کو خوشی ہوئی کہ آپ اس میں مزید اضافہ کر رہے ہیں اور آپ کا دسمبر کا مضمون معارف میں دیکھا بہت عمدہ ہے۔ (البتہ اردو کی آن لائن لائبریریوں میں آپ نے کتاب وسنت ڈاٹ کام کا تذکرہ نہیں کیا)۔ آپ ریسرچ کے کاموں سے واقف ہیں اور اس کی اہمیت سے بھی، ضرورت آج اس بات کی ہے کہ اس کی اہمیت سے طلبہ کو بھی واقف کرایا جائے اور اس کام کو دارالمصنفین کے مقاصد کا ایک جزء لاینفک سمجھنا چاہیے۔

۲۔ ترجمہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ہندوستان میں اردو زبان میں اس کام کی شروعات غالباً سب سے پہلے سرسیدؒ نے کی، لیکن شبلی اس وقت ان کے مخالف تھے۔ مقالات شبلی سوم میں علامہ اپنے مضمون (مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم) کے آخر میں لکھتے ہیں: بانیان سین ٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کو دھوکا ہوا اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثوں نے بذریعہ ترجموں کے علوم کو ترقی دی، ہم بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبے پر پہنچائیں گے، مگر ان کا یہ قیاس غلط اور مع الفارق تھا۔ اول تو ترجموں کا اہتمام اور لاکھوں روپئے کا خرچ جو خلفائے عباسیہ کے زمانے میں ہوا اب غیر ممکن ہے۔ دوسرے اس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی۔ جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئیں یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا۔ اس زمانے میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے نہ ان کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے، جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ تیسرے بڑی غلطی اس قیاس میں یہ تھی کہ اس زمانے میں عربی زبان جس میں ترجمے ہوئے تمام ممالک اسلامی میں حکومت کرنے والی زبان تھی۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ قوم نے اس زبان میں علوم و فنون کو ترقی دی ہو جو ان پر حکومت کرنے والی نہیں ہے۔ مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سید احمد خان صاحب نے جو سین ٹیفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔ (مقالات شبلی، سوم، ص 41)۔ ہم کو نہیں لگتا شبلی مرحوم زندگی کے آخری مرحلے میں اس

سے متفق رہے ہوں گے ۔ بہر حال اب وہ شخصی حکومت کا دور ختم ہوا۔ آپ خود بہترین مترجم ہیں۔مالک بن نبیؒ کی ایک کتاب اور مذہب اور جدید چیلنج کا تو شاندار ترجمہ کیا ہے۔

۳۔ تاریخ نویسی کے ساتھ تاریخ سازی بھی ہو۔ آپ خود بھی تاریخ ساز ہیں اور ہوتے بھی کیوں نہ استاد محترم کی تربیت کا اثر تو ہوگا۔ اگرچہ ہم کو یہ نہیں لکھنا چاہیے لیکن قلم مجبور ہے۔ ہم کو وہ فرق جو آپ کے اور مولانا مرحوم کے یہاں نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ مولانا مرحوم نے بھی دنیا بہت دیکھی تھی۔ بڑے اسفار کئے تھے لیکن وہ دنیا کو اس کے قوانین کی روشنی میں دیکھنے کے عادی تھے۔ آپ نے ایک طویل زندگی مڈل ایسٹ کے ملکوں میں گزاری اور آپ نے اپنے مشاہدہ میں قانون کی حیثیت کو دیکھا اور ملت کی تعمیر کا جذبہ وہیں سے آپ کے اندر اٹھا۔ تاریخ نویسی کے ساتھ تاریخ سازی کے لئے حقیقت سے واقفیت بہت ضروری ہے اور اس کے لئے کتابوں کے مطالعہ کے ساتھ بہت کچھ کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے، ہم امید کرتے ہیں آپ اس پر غور کریں گے۔

صفی الرحمن نبیل
safiurrahmannabeel@gmail.com

(۳)

معارف کے قارئین کے فائدے کے لئے میری درخواست ہے کہ اس کے چھپتے ہی اس کو شبلی اکیڈمی کی ویب سائٹ پر بھی ڈال دیا جائے کیونکہ ڈاک سے بھیجا گیا ہر پرچہ کافی دیر سے پہنچتا ہے اور کبھی ڈاک کے نظام میں خلل کی وجہ سے ملتا بھی نہیں ہے۔ کم از کم علی گڑھ میں ہمارا یہی تجربہ ہے۔

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی، علیگڑھ
zafarul.islam@gmail.com

معارف: اعظم گڑھ میں پوسٹنگ کے بعد معارف کا ہر شمارہ اکیڈمی کی ویب سائٹ پر اپ لوڈ کر دیا جاتا ہے۔ پرچے کی پوسٹنگ تقریباً ہر ماہ کی ۷۔۸ تاریخ کو ہو جاتی ہے۔ پہلے افضل عثمانی صاحب اس کو امریکہ سے اپ لوڈ کرتے تھے اب یہ کام دلی سے ہو رہا ہے۔ اس کا لنک یہ ہے: http://shibliacademy.org/maarif/archives۔ کوشش کی جائے گی کہ ہر ماہ کی ۷، تاریخ کے آس پاس اپ لوڈنگ ہو جایا کرے (مدیر)۔

(۴)

معارف فروری کے شمارے میں ڈاکٹر معین الدین شاہین کا سہ ورقی مضمون دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آخر کس خوبی کی بنا پر شائع ہو گیا۔ کسی طرح کا کوئی حوالہ بھی نہیں ہے اور نہ ایسی کوئی بات ہی، شاہین صاحب نے

کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس میں کہیں یہ نہیں واضح ہے کہ کون سی کتاب ظفر صاحب کی ہے اور کس کے وہ مرتب ہیں۔ اور کس کتاب کا محض مقدمہ لکھا ہے۔ یہ فہرست غلط فہمی پیدا کرتی ہے۔ اس فہرست میں نظم طباطبائی (مونو گراف) کا ذکر نہیں ہے، جو غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہوا تھا۔ اسی طرح دیوانِ ناظم انہوں نے مرتب نہیں کیا تھا اس پر مقدمہ اور تعارف لکھا تھا۔ معلوم نہیں آپ کی نظر سے یہ مضمون گذرا بھی کہ نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مضامین بالکل ہی ایڈٹ نہیں کیے جاتے۔ تحقیقی رسالوں میں کسی مضمون کا شعر سے آغاز ہونا قابل توجہ ہے اور اس صورت میں مزید کہ جب اس شعر پر کسی نوع کی گفتگو مضمون میں نہ ہو۔

ڈاکٹر عمیر منظر
oomairmanzar@gmail.com

معارف: ڈاکٹر معین الدین شاہین کا مضمون ایک اہم شخصیت کے بارے میں ہے جو ہم سے جدا ہو گئی۔ انھوں نے بڑی حد تک اپنی ذاتی معلومات کو استعمال کیا ہے جس کی ریسرچ میں اپنی اہمیت ہے۔ معارف ایک زندہ پرچہ ہے۔ اس کا مقارنہ ان مغربی تحقیقی مجلات سے نہیں کرنا چاہئے جو ہمارے مسائل کو عجائب گھر میں رکھی ہوئی چیز کی طرح دیکھتے ہیں اور پہلے سے طے شدہ نظریئے کی بنیاد پر فیصلے سناتے ہیں۔ ایرانی شاعرہ اعتصامی پر مضمون ایک شعر سے شروع ہوا ہے، جس کا اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ اس پر آپ کا اعتراض بجا ہے (مدیر)۔

دارالمصنّفین کے لیل ونہار

معارف دائمی ٹرسٹ: محترمہ حمیدہ بانو(اورنیڈا، کیلیفورنیا،امریکہ) نے اپنے ٹرسٹ ''اِمداد'' کے ذریعے ''معارف'' کی اِشاعت وترویج کے لیے یک مُشت رقم کاایک دائمی وقف(Endowment) قائم کیا ہے۔اِس سلسلے میں ''اِمداد''اوردارالمصنّفین کے درمیان معاہدے کی رُوسے یہ رقم دائمی وقف کے طورسے اِنْویسٹ(Invest) ہوگی جس کاسالانہ منافع ''معارف'' کے اخراجات کے لیے استعمال ہوگا۔عطیہ دہندہ نے رقم دار المصنّفین کو بھیج دی ہے اور اُس کو ایک مناسب فنڈ میں اِنْویسٹ کیا جارہاہے۔اس سے ''معارف''اِنشاءاللہ ہمیشہ جاری وساری رہے گا۔

عطیہ دہندہ حمیدہ بانو کواردوزبان وادب سےایک قلبی لگاؤہے۔اُنہوں نے راجستھان یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔اے اور جامعہ اردوعلی گڑھ سےادیب کامل کی سند حاصل کی ہے۔وہ امریکہ میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے اور بھارت میں انڈین اِنسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی گاندھی نگر، گجرات میں تدریسی خدمات انجام دے چکی ہیں۔امریکہ میں اردوزبان کی رضاکارانہ خدمت اور ترویج میں بھی وہ پیش پیش رہی ہیں اور بین الاقوامی کانفرسوں اور سمینارز میں اپنے علمی مقالے پیش کرچکی ہیں۔یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ تقریباًایک دہائی قبل جب آئی۔آئی۔ٹی۔گاندھی نگر، گجرات کاقیام عمل میں آیاتواُسی زمانے سے اُنہوں نے وہاں اردوزبان وادب کی تدریس کے ایک مبارک سلسلے کاآغاز کیا۔بالآخرفروری ۲۰۱۹ءمیں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے انڈین اِنسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی گاندھی نگر میں ایک چیئر قائم کی، جس میں اردو زبان وادب کی تدریس کاسلسلہ ان شاءاللہ ہمیشہ کے لیے جاری رہے گا۔اس کے علاوہ انہوں نے حال ہی میں مولاناابوالکلام آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ کاایک نیاعام فہم ایڈیشن مبشّراحسن ندوی کی شراکت کے ساتھ شائع کیاہے(ناشر:ایم آرپبلیکیشنزدہلی)۔

دارالمصنفین کو فرینڈ شپ ایوارڈ: مولاناآزادانٹرکالج،انجان شہیداعظم گڑھ کے بانی مرزااحسان اللہ بیگ مرحوم کے یوم پیدائش پر کالج انتظامیہ کی جانب سے سنہ ۲۰۰۵ سے ہرسال ملک کی ممتاز اور اہم شخصیات اور اداروں کو"فرینڈشپ ایوارڈ" دیاجاتاہے۔اس سال اس نے ملک کے مایہ ناز ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کواس کی علمی، تحقیقی،ادبی،ملی اور قومی سرگرمیوں میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں اس اعزاز سے سرفراز کیا۔ایوارڈکی تقریب سے پہلے طلبہ وطالبات نے متعدد ثقافتی پروگرام پیش کیے۔اس کے بعد یہ ایوارڈدارالمصنفین کے ڈائریکٹر اور صدر مجلس عاملہ ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں نے ۱۸؍فروری ۲۰۲۲ءبروز جمعہ کالج کے مینیجر مرزاعارف بیگ اوراجے کمار سنگھ صدر بابورام کمار سنگھ فاؤنڈیشن کے ہاتھوں سے حاصل کیا۔اس موقع پر کالج انتظامیہ کاشکریہ اداکرتے ہوئےڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے کہاکہ مرزااحسان اللہ بیگ

اور کنور سنگھ کے نام سے منسوب اس ایوارڈ کو لیتے ہوئے ہمیں بہت خوشی ہو رہی ہے۔اس سے علامہ شبلی اور ان کے ادارہ سے آپ کی عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے۔یہ فرینڈ شپ ایوارڈ ہندو مسلم بھائی چارہ اور ملکی اور قومی یکجہتی کی عظیم مثال ہے۔اس قسم کے ایوارڈ کی آج کے وقت میں بہت ضرورت ہے۔ دارالمصنفین میں عربی، اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی کی ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں، آٹھ سو سے زیادہ نادر مخطوطات اور پونے تین سو کے قریب اس کی اپنی مطبوعات ہیں۔انھوں نے ادارے سے استفادہ، تعاون اور اس کی مزید ترقی کے لیے مشورے اور تجویزیں دینے کی حاضرین سے درخواست کی۔طلبہ سے کہا کہ تعلیم نہایت ایمان داری اور محنت سے حاصل کریں، اس لیے کہ تعلیم کے بغیر اس آگے بڑھتی دنیا کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔پروگرام کی صدارت چلڈرن کالج اعظم گڑھ کے بانی بجرنگ ترپاٹھی اور نظامت وائس آف اعظم گڑھ کمیونٹی ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ سیما بھارتی نے کی۔اس موقع پر مولانا عمیر الصدیق ندوی نے بھی خطاب کیا۔آخر میں مولانا آزاد انٹر کالج کی انتظامیہ کے صدر مرزا قمر الحسن بیگ نے شکریہ ادا کیا۔پروگرام کے خاتمے کے بعد ڈاکٹر ظفر الاسلام نے میڈیا کے افراد سے ملک و ملت کے حالات پر بات کی۔کالج کے کیمپس میں وائس آف اعظم گڑھ کمیونٹی ریڈیو اسٹیشن بھی ہے جو اعظم گڑھ کے لیے بڑی بات ہے۔

دارالمصنفین میں یادگاری خطبہ: دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں کا ایک روشن باب یادگاری اور توسیعی خطبات کا اہتمام ہے۔اس سے پہلے علامہ شبلی نعمانی کے افکار و نظریات پر ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر خلیق احمد نظامی، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی، پروفیسر شمس الرحمن فاروقی، وغیرہ یادگاری خطبات دے چکے ہیں۔اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر فخر الاسلام صاحب جوائنٹ سکریٹری دارالمصنفین کی دعوت پر ۲۰؍فروری بروز اتوار بعد نماز مغرب ڈاکٹر علاؤالدین خاں صدر شعبہ تاریخ شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ نے "تاریخ ہند کے تناظر میں علامہ شبلی کی مؤرخانہ بصیرت" کے موضوع پر ایک پر مغز خطبہ دیا اور تاریخ ہند سے متعلق علامہ شبلی کی تحریروں کا جائزہ بڑے سادہ اور معتدل اسلوب میں پیش کیا۔انھوں نے کہا کہ مغربی اور بعض ہندوستانی مؤرخین نے مسلمانوں بالخصوص اورنگ زیب عالمگیر سے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلا رکھی تھیں ان کا علامہ شبلی نے جس طریقے سے علمی اور مدلل جواب دیا ہے اس نے اورنگ زیب کا مطالعہ کرنے والوں کو نئی سمت عطا کی ہے۔صدر جلسہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر علاؤالدین کا مقالہ بڑی جامعیت کا حامل اور قابل قدر ہے۔ضرورت ہے کہ ملک کے مفاد میں تاریخی شبہات کو درست کیا جائے اور دلوں کو جوڑنے والی حقیقتوں کو سامنے لایا جائے۔یہ یادگاری خطبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے کانفرنس ہال میں دیا گیا۔پروگرام کی صدارت ناظم دارالمصنفین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان اور نظامت کے فرائض مولانا عمیر الصدیق ندوی نے انجام دیے۔تلاوت حافظ عبدالرحمن قمر عباسی نے کی۔اس موقع پر دارالمصنفین کے رفقا و ملازمین کے علاوہ شبلی کالج کے اساتذہ اور معززین شہر موجود تھے۔(ک۔ص۔اصلاحی)

رسید کتب موصولہ

آئینۂ احساس: ڈاکٹر سمیہ ریاض فلاحی، ڈاکٹر ندیم احمد، اراضی باغ، اعظم گڑھ، سالِ اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت درج نہیں۔

اقبال اور آرزوئے انقلاب: پروفیسر عبدالحق، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ سالِ اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۱۲۹ روپے

امام الہند رابع نمبر: مکتبہ عکاظ دیوبند، محمد سالم جامعی، سالِ اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۷۰۰ روپے

بریدِ مشرق: ڈاکٹر خوشتر نورانی، خواجہ بک ڈپو، مٹیا محل جامع مسجد، دہلی، سال اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت ۶۰۰ روپئے

رشید حسن خاں کی ادبی جہات: ڈاکٹر ابراہیم افسر، اصیلا آفسیٹ پرنٹرس، کلاں محل دریا گنج، نئی دہلی۔ سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت ۴۰۰ روپئے۔

سرابِ دشتِ امکاں: ڈاکٹر امتیاز ندیم، مکتبہ نعیمیہ، صدر بازار مئو ناتھ بھنجن، یو.پی، سال اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت ۲۷۰ روپے

سیرت خاتم النبیین: مولانا وجیہہ الدین احمد قادری، فرقانیہ کتب خانہ، بدرپور، ضلع کریم گنج آسام، سال اشاعت: ۲۰۲۰ء، قیمت: ۱۵۰ روپے

مکتوبات اسلم محمود بنام ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب: ڈاکٹر شمس بدایونی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت درج نہیں۔

مولانا آزاد سر سید کے بارے میں: ڈاکٹر شائستہ خان، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سال اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت درج نہیں۔

نقشِ پائدار: شاد عظیم آبادی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت درج نہیں۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۴ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یاڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھاحاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبروار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تصانیف ــــ علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	250/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات شبلی (فارسی)	----
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی) 〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی) 〃	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی) 〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی) 〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی) 〃	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ) 〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری) 〃	110/-
خطبات شبلی مرتبہ: عبدالسلام ندوی	150/-
انتخابات شبلی مرتبہ: سید سلیمان ندوی	200/-
مکاتیب شبلی اول 〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم 〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974-7346 Maarif (Urdu) Print MARCH 2022 Vol. 209/3

RNI No. 13667/57 MAARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات